افسانہ نگار

رشیؔ پٹیالوی

قیمت -/۱۸/-　　نیشنل پبلشرز شملہ　　تعداد ۱۰۰۰

پیش لفظ

بڑی عجیب سی شام تھی نہ دل کش نہ کرخت۔ میرا ایک دوست جس کو شعر و
سخن سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں تھا۔ اچانک ہی پھوٹ پڑا۔ "رشی صاحب بھی خوب
شعر کہتے ہیں" میں خاموش ہی رہا وہ آگے بڑھا "رات مشاعرہ میں ترنّم سے ... جی
کا مزہ آگیا" ایسی تمہید میرا وہ دوست اس وقت باندھا کرتا تھا کہ جب اُسے کچھ
مطلب کی بات کہنی ہو۔ .... اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ آج میں کسی حالت
میں بھی خود کو اس کی کسی بھی "مطلب برآری" کا آلہ کار نہ بننے دوں گا۔ میں نے بات
ٹالتے ہوئے کہا "جی ہاں ملٹن نے بھی مرزا غالب کے دیوان کی دو شرح رشی جی
کو ... جھک مارتا رہ گیا"۔ میرا دوست کھوکھلی کھوکھلی نگاہوں سے میری طرف
دیکھتا رہ گیا۔ اور میں نے پوچھا "کون ہیں یہ رشی صاحب؟"
جواب ملا۔ "یہ تو معلوم نہیں"۔
میں نے پوچھا ان کوی جی مہاراج کو اردو شاعری کا مرض کس بد پرہیزی سے لگا۔
جواب تو نہ جانے مجھے کیا ملا۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے ایک وشید جی کی شکل گھومنے
لگی۔ آپ کو شاید "جیم جِ" سے آگے قاعدہ کے حروف یاد نہ تھے۔ مگر چسکا لگ گیا
اردو شاعری کا ...... تین مہینے میں دیوان مرتب کر ڈالا۔ کہا کرتے ہیں۔ "وزن کا
میں پابند نہیں۔ جولانیٔ طبع کو عروض میں مقید کرنا کفر ہے"۔ فاعلاتن فاعلاتن کی
جھک مارنا قدما کا شیوہ تھا"۔ اور نمونۂ سخن اُن وشید جی کے سوائے ایک شعر کے
میرے پاس اور موجود نہیں فرماتے ہیں۔

"ہماری عید بھی کیا عید ہے
اُن کو میری شوقِ دید ہے

مومنؔ مرحوم بھی اپنی اندھیری قبر میں لوٹ پوٹ ہو گئے ہوں گے۔ جب دیدی جی پر یہ الہام نازل ہوا ہو گا...... میں نے سوچا رشیؔ بھی کوئی ایسا ہی شاعر ہو گا...... تخلص ہندی کا دخل اردو شاعری میں...... بہتوں کو یہ شاعری کا جنون سوار ہوتا آیا ہے۔ حتےٰ کہ ایک دفعہ ضامنؔ صاحب گھبرا کر چیخ اُٹھے تھے ؎

"تیری اُردو نے زمانے بھر کی بازی مات کی"
شاعر اتنی فی صدی تعلیم سو میں سات کی

میں نے طنزاً پوچھا "کوئی شعر یاد ہے رشیؔ صاحب کا........
جواب مِلا" اُن کا یہ شعر حاصل مشاعرہ تھا ؎

"تمہاری جستجو ہو یا خود اپنی جستجو مجھ کو"
میری تقدیر میں آوارگی یوں بھی ہے یوں بھی ہے

میرے قیاس کے سر پر شعر پتھر کی طرح آ کر پڑا...... شعر سُن کر میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کتنی مشکل زمین میں کتنا ہموار شعر تھرک رہا تھا۔ غزل کا شعر تھا..... مگر بیشتر متغزلین کی طرح جستجوئے یار شاعر کو ایسے افلاطونی آسمان پر کھینچ کر نہیں لے گئی تھی جہاں کی ہوائیں مشک بیز ہوتی ہیں یا جہاں اپنی خبر نہیں ملتی۔ شاعر اسی دُنیا کا انسان ہے اور اُس نے انسان بنے رہنے ہی میں خیر سمجھی ہے۔ ایک انسان کی طرح اُس نے اپنی آوارگی کا اعتراف کیا ہے۔
میں نے پوچھا" اور کوئی شعر؟"
جواب مِلا۔ "بس ایک شعر اور یاد ہے مجھے رشیؔ صاحب کا"...... اور شعر تھا

دہر کے جورِ آسماں کے ستم
اے دلِ صبر آشنا کب تک؟

میرے احساس نے اعتراف کیا کہ " شاعر محض ایک صحرانوردہی نہیں ہے کہ جسے اپنی آوارگی پر ناز ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ ایک خوددار انسان بھی ہے کہ جو " دہر کے جور" اور " آسمان کے ستم" کے خلاف سپر ڈال دینے سے گریزاں ہے۔ اُس کے پہلو میں وہ خوددار دل دھڑک رہا ہے جو بربریت کے خلاف " صبر آشنا" ہونے کو بھی ایک علت سمجھتا ہے.......... میں نے تعجب سے پوچھا ایسے اچھے شاعر نے تخلص کیوں اتنا دقیانوسی رکھا ہے؟ کوئی تسلی بخش جواب بھی نہ ملا اور بات بھی آئی گئی ہو گئی۔

اور پھر مدت بعد ایک ویسی ہی شام کو میرا ایک ہموطن نوجوان میرے کمرہ میں داخل ہوتا ہوا بولا " بڑی مدت کے بعد آپ کے نیاز حاصل ہوئے......

اور واقعی میں اُسے دس بارہ برس بعد مل رہا تھا۔

میں تپاک سے ملتے ہوئے بولا " آئیے بام دیو جی"

بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں...... اچانک ہی " بام دیو جی" اصرار کر اُٹھے " کوئی تازہ غزل سنائیے"

میں نے سچ بولا جب کہا " میں نے شعر کہنے ہی چھوڑ دیئے"

بام دیو جی میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے...... " یقین نہیں آتا" میں نے پوچھا " کہیئے آپ کو یہ شعر و شاعری کا شوق کب سے ہو گیا ہے"؟

اور اچانک راز کھلا جب انہوں نے کہا"...... جی! میں رشی تخلص کرتا ہوں"۔ میں سن کر ششدر رہ گیا....... میں نے کہا " آپ کی تعریف سنی ہے...... تو آپ ہیں رشی صاحب؟ بڑی انکساری تھی جواب میں...... " ذرہ نوازی ہے آپ کی......"

پھر میں نے بے دھڑک ہو کر پوچھا " یہ آپ نے تخلص کیوں اتنا دقیانوسی

رکھا ہے ؟ اور اُتنا ہی لوکیلا جواب تھا " میں تعمیر کا حامی ہوں تخریب کا نہیں ...... اس تخریب تک کا حامی بھی کہ جس میں صورتِ تعمیر مضمر ہو ...... میرا عقیدہ ہے کہ جب بھی اِنسان کسی تخریب کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنی ذہنی اخلاقی اور معاشی شکست سے جھنجھلا کر ہی ایسا کرتا ہے ورنہ وہ جنہیں کشمکش اور جدو جہد نے زندہ رہنے کا پیغام دیا ہے کبھی بھی تخریب کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ اُن کے حوصلے انہیں لبیک کہیں گے ۔ اُن راہوں کی طرف کہ جن پر چل کر اِنسان ...... اس دھرتی کا اِنسان اپنی کاوشوں سے ظلمتوں کو نیست و نابود کرنے کی بجائے انہیں جان فزا اُجالوں میں تبدیل کر دیتا ہے "...

میں نے اعتراض کیا " یہ آدرش پرستی ہے "

جواب صاف مگر مہذب تھا " اور ہم اکثر اپنی شکست کا اعتراف یوں بھی تو کر لیتے ہیں کہ جب کوئی اعلےٰ مقصد ہمیں اپنی پہنچ سے بعید نظر آتا ہو اور اُس مقصد کو حاصل کرنے کی جدو جہد کو یا اُس مقصد کی صحیح تعریف کو آدرش پرستی کا نام دے دیتے ہیں۔

دلیل واجب تھی میں سوچ میں پڑ گیا ...... مگر بام دیو جی بولے ...

مجھے اپنے وطن کے وسیع مگر تاریک کھنڈر میں کچھ ایسے بھی اِنسان نظر آتے ہیں جنہوں نے کبھی انسان کو بربریت ۔ ظلم ۔ اخلاقی اور ذہنی تنزل ...... کم مائیگی اور شکستِ ضمیر کی ظلمتوں سے نکال کر زندگی کو ابدی اور حقیقی سمجھنے کا پیغام دیا تھا ...... اور پھر بدیشی آقاؤں نے ہمارے ہم وطنوں کو طوقِ غلامی پہنا کر اپنے غلاموں کے ذہنوں سے ان پیامبرانِ حیات کی یاد کے نقوش بھی مٹا دینے کی کوشش کی کہ کہیں غلام رازِ خودداری سے آگاہ ہو کر اپنے آقاؤں سے اپنا حق مانگنے کی جرات نہ کر بیٹھیں ...... اُن

ظلموں نے ماضی کے دل کش دھندلکوں کو ہولناک اندھیروں میں تبدیل کر دیا۔ حسین محلات کو گھناونے کھنڈر بنا دیا۔ مگر ہمارے بزرگوں کی ان انتھک جدوجہد نے جو پیامِ زندگی ہمیں دیا وہ ان ہولناک اندھیروں اور گھناونے کھنڈروں کے ملبہ تلے دفن نہ ہو سکا...... مجھے ماضی کی اُس تاریک دُنیا میں وہی انسان نظر آتے ہیں...... وہ اپنے وقتوں میں رشیؔ کہلاتے تھے۔ میں اُن کے ردِّ عمل اور اُن کی ابدی کاوشوں سے متاثر ہُوا اور میں نے اپنا تخلص اُن کے اس لقب پر رکھ لیا جو عوام نے انہیں دیا تھا۔ اور رشیؔ کے پُوچھنے میں عجب معصومیت تھی جب وہ بولا

"اور پھر آپ ہی بتایئے کیا یہ تخلص اس زنانہ لقب۔ صباؔ۔ شمیمؔ یا شمشیر تلوار سے بہتر نہیں ہے۔ کیا یہ تخلص اُن انسانوں کی یاد نہیں دلاتا جو انسانی زندگی کو ایک جامع نصب العین کی طرف لے جانے کے لئے زندہ رہے اور اُسی کے لئے مرے......"

کس میں جرأت ہو سکتی تھی کہ ان باتوں کو سُن کر کوئی اُن سے پوچھے کہ اُنہوں نے "دقیانوسی" تخلص کیوں چھانٹا ہے۔ رشیؔ کے یہ دلائل سُن کر مجھے اُس کے تخلص سے کشمکش...... شرافت...... پاکیزگی...... مستحکم صبر اور ریاضت کی وہ شعائیں پھوٹتی نظر آئیں کہ جن کی ضیا میں کبھی اس دھرتی کے سپوت اپنے رفیقوں کے ہمراہ امن و آشتی کی منزلوں تک پہنچ جایا کرتے تھے......

۱۹۱۷ء کی جنوری کو رشیؔ نے ضلع ہوشیارپور (پنجاب) کے ایک مشہور قصبہ بسی کلاں میں زندگی کی سحر کو خوش آمدید کہا...... اُس نے اولین سانس مصر براہمنوں کے اس قدیم خاندان میں لی کہ جس کے بارے میں

موجودہ تاریخ دانوں کا فیصلہ ہے کہ یہ لوگ ہندوستان میں مصر سے فرعون کے زمانہ میں وارد ہوئے تھے .... شاید یہی وجہ ہے کہ رشی کے اندر فرعونیت کے خلاف ہمیشہ ایک پاکیزہ جذبہ موجزن رہتا ہے کہ جو اکثر اُس کے اشعار اور اُس کے افسانوں سے پھوٹ پھوٹ کر اُبلتا ہے۔ وہ شخصی آزادی کا قائل ہے اس آزادی کی حفاظت اور حمایت میں اس کی قلم ہمیشہ ہی تڑپتی رہتی ہے ....

رشی نے زندہ رہنے کے لئے کتنی جدوجہد کی ہے یہ اس کے چھریرے جسم ...... اور اس کی سیاہ پتلیوں کے پیچھے سے جھانکنے والے اَن تھک عزم اور لب ولہجہ کی اس سنجیدگی سے عیاں ہوتا ہے جو زمانہ کی چیرہ دستیوں اور زیست کی کشمکشوں ہی کی دین ہوتے ہیں ...... زندگی کے اُتار چڑھاؤ نے اُس کے دماغ میں بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی پیدا کر دی ہے۔ وہ ہمدردی جو کبھی اُس نے اُن فلم پروڈیوسروں سے مانگی تھی جنہوں نے اُس کے نغموں کو چُرا کر اپنے جاہل منیموں کے نام پر پردۂ سیمیں کی نذر کیا ...... وہ ہمدردی جو اس کے آقاؤں نے اُسے دینے سے انکار کر دیا ..... اور جنہوں نے اُسے ایک ادیب۔ ایک شاعر۔ ایک انسان نہ سمجھ کر ایک معمولی کلرک سمجھتے ہوئے اس کی ہڈیوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے میں کسر نہ چھوڑی .... وہ زندہ بچ گیا ...... اور زندگی بچاکر ایک ادیب اور ایک شاعر رہ گیا .... یہ اُس کی سخت جانی کا ثبوت نہیں بلکہ اس کے عزائم کی پختگی کی دلیل ہے ....

وہ اس روحانیت کا قائل نہیں جو انسان کو زندگی سے فراری کا راستہ دکھائے " دو آنسو " افسانہ میں اُس کی قلم " سیٹھ جی " کے لہجہ میں کس زور سے

گرجی ہے۔" میں کیوں نہ کہوں یہ سب کچھ۔ ہندوستان میں ہزاروں ایسے مہاتما بھگوان کے فرضی ایجنٹ بنے گھوم رہے ہیں۔ کیا فرق ہے اُن میں اور ایک نمائشی دوکاندار میں؟ نمائشی دوکانداروں کے پاس خوبصورت شورُوم ہوتے ہیں۔ جن میں دلکشی اور جاذبیت کے سامان رکھے جاتے ہیں اور اِن نمائشی مہاتماؤں کا شورُوم ہوتا ہے اِن کا چہرہ جس پر بھولاپن، معصومیت اور روحانیت کے فرضی مِلے جُلے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے..........

اِن کے گیروے کپڑے...... اِن کا ترک اور تیاگ کا اُپدیش اُپدیش کے وقت اِن کا آنکھیں موندنے کا انداز.... آہیں بھر بھر کر بھگوان کو پکارنے کی طرز گویا یہی صرف بھگوان کو جانتے ہیں........ یہ سب اپنے چیلوں کے دلوں پر ڈاکہ ڈالنے کی چالیں ہوتی ہیں۔ ساوتری .....اِن کی دوکان میں جاؤ اور اپنے ایمان اور محنت کی قیمت ادا کردو ...... وہاں سے پاپ دھونے کا صابن مل جائے گا۔"......

کتنا صحیح مشاہدہ ہے سماج کا اور سماج کی خامیوں کا۔ ایک دو نہیں لاکھوں ایسے اشخاص کہ جو زندگی کے ہنگاموں سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ اکثر گیروے کپڑے ہی زیب تن کرتے ہیں.... سادہ لوح عقیدت مند نہیں اُن کا حُلیہ دیکھ کر نہ صرف اپنی عقیدت ہی پیش کرتے ہیں بلکہ اس روٹی اور کپڑے کا بیشتر حصہ بھی اُن کی نذر کر دیتے ہیں جو وہ اپنا لہو پسینہ ایک کر کے حاصل کرتے ہیں...... اگر محض اتنی سی ہی بات ہوتی تو اس کا علاج آسان تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ زندگی کی جدوجہد سے اِن "مغرور" بزدلوں کے تجربات ادھورے ہوتے ہیں...... دُور اندیشی

سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ صبر و تحمل سے انہیں دُور کی نسبت بھی نہیں ہوتی مگر اہلِ عقیدت اُن کے ہر لفظ کو خدائی حکم سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجہ ہوتا ہے " خاندانوں کی تباہی۔ اپنوں میں منافرت .... رشی نے اِن ربی دلالوں کے کردار کو عریاں کر کے اُس گھناونے ناسور کو بے نقاب کیا ہے جو صدیوں سے سماج کے شعور اور صحت میں گھن کی طرح سڑ رہا ہے۔۔ رشی ایک ایسا بے خوف شاعر اور افسانہ نگار ہے جس نے یہ جرأت یہ کوشش اس خوبی سے کی ہے۔ سوامی آتمانند کے کردار میں وہ تمام سڑاندھ مقید ہے جو بہت سے چلتے پھرتے گیروے بھبکوں سے اُبل کر سماج اور قوم کو ناکارہ بناتی جا رہی ہے۔

سیٹھ کشن لال ایک سرمایہ دار ہے۔ دولت کی ہوس اُسے ذلیل سے ذلیل کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سوامی آتمانند کے گمراہ کُن اُپدیش اُسے گناہ کے راستہ پر دھکیلتے چلے جاتے ہیں........ ایک وقت آتا ہے جب سیٹھ کشن لال کا ضمیر اور زیادہ بارِ گناہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ سرمایا داروں کے خلاف۔ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کے خلاف اور اِن کے روحانی مددگاروں کے خلاف غرضیکہ سرمایہ داری کی دُنیا کے ذرہ ذرہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا ہے۔....... ضمیر کی آواز سیٹھ کشن لال سے دبائے نہیں دبتی........ افسانہ کے اس نازک اور لطیف مقام پر اگر کوئی اناڑی افسانہ نگار ہوتا تو ٹھوکر کھا سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں یا تو سیٹھ کشن لال خودکشی کر لیتا یا پھر اپنے گورو سوامی آتمانند کی طرح راہِ فرار اختیار کر لیتا۔ مگر رشی کی نگاہ میں زندگی فتح کا نام ہے شکست کا نہیں۔ زندگی وہ دُرِ شہوار ہے جس کو کسی بھی حالت میں کسی بھی ناکامی کے سر سے نثار نہیں کیا

جاسکتا - اور نہ ہی صرف اعترافِ گناہ گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتا ہے - سیہ ترین
جرم کا داغ بلند ترین نیکی ہی دھو سکتی ہے - اور یہی ہے وہ پیغامِ حیات جو مہاتما
گاندھی نے وطن کو دیا ہے - زر کی فراہمی ذاتی اور شخصی اغراض کے لئے نہایت
سنگین جرم ہے - مگر سماج کے لئے اگر یہی زر فراہم کیا جائے تو شاید اس سے بڑی
کوئی خدمت نہ ہوگی - اس کو فراہم کرنے والا اس زر کا محض ایسا محافظ اور
نگران ہے جو ہر وقت اس امر کا نگہبان رہے کہ دولت سماج کے ہر فرد کی مساوی
ملکیت ہے یہ فراہم کرنے والے کی یا کسی دوسرے کی ذاتی اجارہ داری نہیں ہے
اس دولت میں محض وہ اتنے ہی حصے کا حق دار ہے کہ جس قدر حصہ کا حق دار
سماج کا کوئی دوسرا رکن ہے جو فراہمیِ زر نہ کر کے اپنا دوسرا ایسا فرض ادا کر رہا
ہے جو اُس پر عائد کیا گیا ہے - یہی "تھیوری آف ٹرسٹی شپ" ہے - یہی وہ سیاسی
معاشی - اخلاقی - سماجی اور اقتصادی اُلجھنوں کا واحد حل ہے جسے مہاتما گاندھی
نے اپنی طویل زندگی کے باریک ترین مشاہدوں اور عظیم ترین تجربوں کے بعد ملک
کے سامنے پیش کیا ہے ...... یہی وہ حل ہے جو رشی نے سیٹھ کشن لال
کے سامنے رکھا جس پر عمل کر کے سیٹھ کشن لال اپنے گناہوں کے دھبوں کو
دھو سکا .... رشی پر الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے سیٹھ کشن لعل
کے کردار میں ایک ایسی دنیائے قیاس کے فرد کی تخلیق کی ہے جسے اس دُنیا
سے کوئی واسطہ ہی نہیں - اور اس لحاظ سے وہ بہ حیثیت ایک افسانہ نگار
ناکامیاب ہے - اوّل تو یہ فیصلہ کر لینا کہ سیٹھ کشن لال جیسے انسان اس دُنیا
میں ہوتے ہی نہیں سخت غلطی ہوگی - ہندوستان میں گاندھی جی نے جب
بھی آزادی کے لئے کوئی تحریک چلائی ایک دو نہیں سینکڑوں ایسے ایثار پسند
انسان میدانِ کارزار میں اُترے جنہوں نے اپنی سب دولت عوام اور عوامی

مفاد کے حوالے کر دی۔ دوئم فن کی نظر سے اگر افسانہ نگار محض تاریخ دان
یا ماہر نفسیات بن کر رہ جائے تو وہ کبھی کامیاب افسانہ نگار نہیں کہا جائے
گا۔ شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی اپنے قارئین کو کوئی بات کہنی ہوتی ہے جسے
کہتے وقت اسے افسانہ نگاری کی اصطلاحی کسوٹی پر پورا اتارنا ہوتا ہے ورنہ
افسانہ نگار ایک نامہ نگار یا رپوتاژ نویس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔
آدرش وادی افسانہ نگار صف اوّل کا افسانہ نگار ہے اگر وہ اپنے کرداروں
میں جان ڈال سکے .... "گورکی" نے اپنی تخالیق میں جن کرداروں
کو اجاگر کیا ہے اس قسم کے انسان اُس کے زمانے میں سرزمین روس
میں سانس نہیں لیتے تھے۔ گورکی کے کردار اس کے خوابوں اور
آدرشوں کے فرد ہیں۔ مگر گورکی نے اُنہیں صفحہ قرطاس پر یوں اُتارا ہے کہ
وہ اس دُنیا کے انسان معلوم ہونے لگے۔ اور یہی گورکی کی کامیابی کا راز
بن گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ سیٹھ کشن لال جیسے لوگ
ہندوستانی سرمایہ داروں کی دُنیا میں نہ رہتے ہوں گے مگر وہ رشی کے
خوابوں اور آدرشوں کی دُنیا کا سرمایہ دار ہے اور رشی نے اُسے سطحِ کاغذ
پر زندہ انسان بنا کر اُتارا ہے۔ رشی تخریب کا نہیں تعمیر کا حامی نظر آتا ہے
وہ سرمایہ پرستی کا قلع قمع یوں نہیں کرنا چاہتا کہ ہر سرمایہ پرست کو گولی مار
دی جائے ...... گناہ سے گناہ کا علاج کرنا اس کے قیاس میں بھی نہیں جچتا
اور یہی وہ بات ہے جس کے لئے اُس نے "دو آنسو" افسانہ لکھا اور کامیاب
ہُوا۔

سرمایہ داروں کے سدھار کا علم بردار بن کر رشی مزدوروں کی آہوں اور
کے دکھ دردوں اور سرمایہ پرستوں کے ہاتھوں اُن پر نازل ہونے والے مظالم

کو بھُول نہیں گیا ہے ۔ یہ افلاس زدہ مظلوموں کی آہوں ہی کا اثر ہے کہ رشیؔ شکست خوردہ افسانہ نگاروں کی طرح سرمایہ پرستوں کے خون کے دریا بہاتا بہاتا انہیں گالیاں نہیں دینے لگ پڑا ہے ۔ بلکہ اُن کے کانوں میں اپنے افسانوں کے ذریعے حقائق کا ایک بلند آہنگ صُور پھونک رہا ہے ۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے "تم خار دار جھاڑیاں بن کر رہ گئے ہو ...... تیز دھار تیشے تمہیں جڑھوں سے کاٹ کر پھینک دیں گے ۔ اگر تم مزدوروں کی کمائی خود اکیلے ہضم کرتے چلے گئے ۔ تم غریبوں کی دولت کے امانت دار ہو تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ تم مفلسوں کے محافظ بن جاؤ تم ایسی خار دار جھاڑیاں بن کر زندہ نہیں رہ سکو گے جو دُنیا بھر کے تنفر کے کانٹوں کو اپنی آغوش میں سمیٹے رہتی ہیں ۔ زندگی چاہتے ہو تو ننھے منے پھولوں کی حفاظت کرنا ہوگی" .... رشیؔ سرمایہ داروں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کرتا ہے .... مگر اس طرح کہ جنگ ہو مگر خون کا ایک قطرہ نہ بہے ...... ہندوستانی عظمت اور تقدیس کا بھی تو یہی تقاضہ ہے اور اسی تقاضے کو مہاتما گاندھی نے بھی تو یونہی نبھایا ہے ۔

رشیؔ کے کردار مزدور اور فاقہ کشوں کے کردار ہیں مگر وہ فاقہ کش جو والگا کے طوفانوں سے نعرۂ انقلاب کے پیغام نہیں سُنتے بلکہ گنگا کی لہروں کی تڑپ سے زندگی کو حیات دیتے ہیں ان مصیبت زدہ بھوکے اور ننگے انسانوں کا درد اس کے دل میں اتنا ہی سمایا ہُوا ہے جتنا کہ ایک بڑے سے بڑے روس نواز ترقی پسند کے دل میں ہوگا ...... افسانہ "شرابی" میں اس کے یہ الفاظ کتنے شعلہ بار انگارے ہیں ۔

"مگر مزدوروں کی یہ دلیل کہ سیٹھ کے کارخانہ کی چکیوں میں پسی ہوئی ہڈیوں کو زندہ رکھنے کے لئے اس زہر کو پینے کی ضرورت پڑتی ہے میری زبان

بند کرا دیتی تھی"

اور یہ دلیل رشی کے افسانہ کے اس کردار ہی کی زبان بند نہیں کراتی بلکہ اُن بڑے بڑے سندھارکوں کے لبوں پر بھی قفل لگا دیتی ہے جو شراب بندی کے حق میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ رشی نے اپنا نظریہ کس انداز سے پڑھنے والوں کے دماغ پر نقش کر دیا ہے کہ سماجی غلاظتیں دُور نہ ہوں گی تاوقتیکہ عوام کی اقتصادی اُلجھنوں کا علاج نہ کیا جائے"

رشی صحیح معنوں میں عوام کا افسانہ نگار اور شاعر ہے۔ اُس کے کردار وڈکا (Vodka) کے سرور میں ہر کفر کو ایمان نہیں سمجھ بیٹھتے۔ وہ ہندوستانی عوام کے کردار ہیں وہ ہندوستانی مٹی سے اُبھرے ہیں۔ وہ ہندوستانی دھرتی کے سپوت ہیں اور اُنہیں اتنا ہی ناز ہے اپنے وطن پر جتنا کسی رُوسی کو اپنے father land پر ہوگا۔ وہ افلاس سے تنگ آکر بھپرتے ہیں تو ہندوستان کی نجات کے لئے رُوس کے ایوانوں کی طرف نہیں بھاگتے وہ گہری ظلمتوں میں گھِر جاتے ہیں تو اپنا وطن اور وطن کے مفاد کو بیچ کر وہ بدیشی ٹارچ خریدنے کی بجائے اپنے وطن کے قدیم ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کو ترجیح دیتے ہیں وہ چراغ جس میں مہاتما گاندھی اور دوسرے سینکڑوں شہیدوں کا لہو جل رہا ہے۔

رشی کی تحریر میں اگر شرافت اور شائستگی کا چلن ہے تو طنز کے نوکیلے نشتر بھی...... مگر گالیاں نہیں۔ افسانہ "افسانہ نگار" میں اُس کی قلم نے کیا تیر چھوڑے ہیں۔

"دلیپ بولا" عظیم کو دیکھا ہوگا...... وہ دُبلا پتلا لمبے لمبے بالوں والا عظیم...... وہ ترقی پسند شاعر...... بڑا بنا ہُوا کاٹیاں ہے نالائق ...... مزدوروں اور کسانوں کو سُرخ سویرے کا پیغام دیتا دیتا مرا جا

رہا ہے۔......مگر تم اگر اس کی کھوپڑی کو چیرو تو اندر سے قدامت پسندی کے فریب کا وہ زہریلا لاوا نکلے گا کہ دیکھ کر بے ہوش ہو جاؤ"......اور پھر دلیپ بولا" واقعی رشی تمہیں یاد ہو گا ایک جگہ شکسپیئر نے کہا ہے کہ خوشامد پسند کی خوشامد پسندی انتہا پر اس وقت پہنچتی ہے جب وہ اپنے خوشامدیوں سے کہتا ہے کہ اُسے خوشامد قطعی پسند نہیں ہے......اسی طرح اِن رجعت پسندوں کا۔ اِن کی رجعت پسندی کا ننگا ناچ اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ عوام میں ترقی پسند ہونے کا دعوے کر کے اُن کی ہمدردی اپنے بودے اشعار اور پھسپھسے مضامین سے خریدتے ہیں۔"زردار یہ سودا اپنے روپیہ سے کرتا ہے......اور یہ لوگ اپنے کلام سے......اِن کے کلام میں نہ آرٹ ہوتا ہے نہ جان......اِن کی ٹیکنک ہوتی ہے کسی بھی طرح عوام کے جذبات کو بھڑکایا جا سکے......ابن الوقت کہیں کے......اُس دن وہ بھنڈی بازار والے مشاعرہ میں عظیم لے اپنے ایک قطعہ سے مشاعرہ لوٹ لیا......اُسی کا یہ ایک شعر تھا ؎

ذہنِ زردار میں اِک جادوگری رہتی ہے
گردن پہ غریبوں کے چھُری رہتی ہے

توبہ......پہلا مصرع میلوں لمبا اور دوسرا شروع بھی نہیں ہُوا کہ ختم ہو گیا......مگر وہ واہ واہ ہوئی......وہ داد ملی شاعر کو کہ پوچھو نہ......کیوں نہ ملتی......دوسرے مصرعے میں شاعر نے غریبوں کی گردن پہ چھُری چلوائی تھی......اور وہ بھی ترنم سے گا گا کر......بہروپیا کہیں کا"

رشی ایک مفلس مگر خود دار ادیب ہے اور اُسے اپنی مفلسی اور خودداری

دونوں ہی پر ناز ہے۔ رشی اُن ترقی پسند ادیبوں میں سے نہیں ہے (اور یہ اس کی بدقسمتی ہے) کہ جو عوام کی بے چارگی اور لاچاری پر آنسو بہاتے نہیں تھکتے مگر جن کا اپنا بنکوں میں ہزاروں کا سرمایہ جمع ہے۔ جن کو سینکڑوں کی آمدنی روزانہ ہفتہ وار اور ماہانہ اخباروں سے ہے جن کی فلم کمپنیاں چلتی ہیں۔ جن کے تجارتی ادارے ہیں۔ جن کے پیچھے تالیاں بجانے والے اور واہ واہ کا شور مچانے والے گروہ کے گروہ ہیں۔ اور جن کی جیب سے ایک پھوٹی کوڑی بھی کبھی کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں نکلتی .... کاش یہ نعمتیں رشی کو نصیب ہوتیں تو آج شاید وہ آسمانِ صحافت پر خورشیدِ منور کی طرح چمکتا ....

آج کل افسانہ نگاروں کا ایک طبقہ ترقی پسندی کی آڑ میں عُریانیت کو اپنے بے ربط افسانوں کے غلیظ لبادران میں رکھ کر نوجوانوں کے شعور میں زہر بھرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اُن کی اپنی ایک جماعت ہے۔ اُن کے اپنے ادارے ہیں۔ یہ کسی بھی ایسے ادیب کو نہیں جھیل سکتے جس کی تخالیق سے جنسی تعفن نہ اُبلتا ہو۔ وہ پرستارِ ادب جو اپنے سُلجھے ہوئے خیالات کو شائستگی کی طشت میں رکھ کر آرٹ اور ادب کی خدمت کرتا ہے اُن کے نزدیک قدامت پسند ہے۔ رجعت پسندوں کا دلال ہے۔ بہت ممکن ہے کہ رشی کے یہ افسانے اُن کے "مذاقِ سلیم" کی کسوٹی پر پُورے نہ اُتریں۔ مگر وہ جو آرٹ کو محض عریاں نگاری ہی نہیں سمجھتے وہ ذوقِ سلیم کے آرٹ فہم لوگ جن کی نگہِ لطیف میں چاند کی برہنگی بھی ایک خلش پیدا کر دیتی ہے اور جو اس پر ایک جھینی جھینی بدلی کا آنچل ہی اُس کی شوکتِ جمال کی وجہ ملزوم سمجھتے ہیں یقیناً رشی کے افسانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے خواہ ایسے لوگوں کی

تعداد کم کیوں نہ ہو۔ صحیح ادیب کو ایک ادب نواز کی داد جس مسرت کا باعث ہوتی ہے وہ دس ہزار جہلا کی بہم تالیاں اور فلک شگاف نعرے نہیں دے سکتے۔

رشی بودے اور متزلزل پلاٹوں پر فطریات کے تلخ نظریے بُن کر یا جنسی بھوک کی فتنہ ریزیوں کو کلام کی چاشنی دے کر قارئین کے سامنے اچھال دنیا افسانہ نگاری نہیں سمجھتا ہے اُس کے افسانے کے پلاٹوں میں وہی ربط وہی تانا بانا وہی پختگی۔ اور فن کی وہی عظمتیں ہیں جن کا معیار بنکم بابو۔ منشی پریم چند اور شرت چندر چٹوپادھیائے نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اُس کے المیہ اور طربیہ دونوں قسم کے افسانوں میں آپ کو تبسم۔ طنز۔ زبان (climax)۔(Anticlimax) تناسب (Tempo) غرضیکہ ہر وہ چیز نہ ملے گی جو ایک اعلےٰ درجہ کے افسانہ کے خمیر میں ہونی چاہیئے اور اس پر دال یہ کہ اُس کے افسانے ہمارے سماج کا آئینہ ہوتے ہیں کہ جس میں سماج کی خوبیاں۔ خرابیاں۔ تکالیف اُلجھنیں اور جدو جہد سب کچھ نظر آتا ہے اور وہ بھی ایک پاکیزگی کے ساتھ...... نہ کہ یوں کہ غلاظت اور عُریانیت کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں۔ سماج کا کوڑھ اس طرح پھوٹا پڑ رہا ہے کہ پڑھنے والے کے دماغ میں اُس غلاظت کو سدھارنے کا خیال آنا تو کجا خود ہی شدتِ تعفن سے پھٹ جائے اور تودۂ غلاظت ہو کر رہ جائے.......

کاش کوئی رشی کی صحرا نوردی پر پابندی لگا سکے اور اس سے ایسے ہی افسانے لکھواتا چلا جائے اور ادب و آرٹ کے صحیح قدر دانوں کو نہ صرف اُن کی ادبی خوراک ہی مل سکے بلکہ اُن کی تعداد اور اُن کی آواز میں اتنی طاقت پیدا ہو سکے کہ آج وہ لوگ جو جنسی مسائل پر من مانے تبصرات

کا نام افسانہ نگاری رکھ رہے ہیں عوام کے شعور کو اور زیادہ غلیظ نہ کر سکیں۔

ناظم وجدانی

دھلی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء

شرابی

وہ سو رہی تھی .... دُنیا اور دُنیا کے فریبوں سے بے نیاز ہو کر وہ سو رہی تھی - عارضی سکون کی آغوش میں .... شائد دیوتا اس کے خوابوں کی دُنیا میں کیف ومستی کی رنگینیاں بھر رہے تھے - جو کہ ایک لطیف سی مسکراہٹ بن کر اس کے لبوں پر ناچ رہی تھیں

کسی کی ڈگمگاتے ہوئے قدموں نے آہستہ سے بڑھ کر آنگن کے دروازے کھولے .... وہ برامدے میں سے ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ اسی دروازے تک پہنچ گیا جس میں چمپا سو رہی تھی .... دروازہ آہستہ سے کھلا اُس نے دیکھا چمپا بے خبر سو رہی ہے -

دُور کہیں کتا رو دیا .... وہ ٹھٹک گیا

چمپا نے کروٹ لی .... وہ قدرے سہم گیا

رات کی بکھری ہوئی خاموشی پھر سمٹ گئی .... وہ تک رہا تھا .... سوتی ہوئی چمپا کے داہنے ہاتھ پر چمکتے ہوئے روپہلی کنگن کو .... اُس نے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا - اُس کی کانپتی ہوئی انگلیاں کنگن تک پہنچ ہی گئیں - چمپا کی نیند کھل گئی - اُس نے دیکھا کوئی ہیبتناک چہرہ تین چوتھائی حصے سے زیادہ ایک میلے سے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا - اور دو سُرخ سُرخ آنکھیں گھور گھور کر اس کو دیکھ رہی تھیں .... چمپا کی چیخ نکل گئی .... دوسرے ہاتھ نے چمپا کا منہ سختی سے بند کر دیا - کچھ لوگ کمرے میں آ گئے انہوں نے چور کو پکڑ لیا - اُس کے منہ سے کپڑا اُتار دیا گیا

......چمپا کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں.......سب لوگ چور اور چمپا کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے...............
چور کھڑکی میں آ کھڑا ہُوا.......وہ بادلوں میں ڈوبتے ہوئے چاند کی طرف دیکھ رہا تھا...........چمپا بھی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی - کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چمپا نے کہا.......ناتھ!....آپ!
برج لال نے جواب دیا "ہاں! چمپا! میں ہی تھا۔
چمپا نے کنگن اتار کر برج کی طرف بڑھا دیا - برج کی ہچکیاں بندھ گئیں وہ بولا چمپا!.......اِس کنگن کو لینے کی طاقت اگر کچھ تھی تو اس برج میں تھی جو اپنے آتما کی نیکی کو رات کی سیاہی میں غرق کر کے بے شرمی کا نقاب اوڑھ کر ایک چور بن کر اپنے ہی گھر میں آیا تھا.......اس کنگن کو چرانے کے لئے تمہارے پتی برج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کنگن کو تم سے لے سکے.......چمپا میں نے یہ کنگن اپنی آرزوؤں سے سجایا تھا۔ اس کنگن کو میں نے اپنے ارمانوں میں لپیٹا تھا......اس کنگن کی چمک میں ہمارے خاندان کا اتہاس جگمگا رہا ہے۔ اس کنگن کو ہمارے ونش میں بڑا لڑکا سہاگ رات کو اپنی دھرم پتنی کو دیا کرتا ہے - وہ تھا شریف.......نیک.......اچھے خاندان کا برج جس نے تمہیں یہ کنگن دیا تھا۔ اور یہ برج؟ یہ برج چور ہے.......اس برج کی آتما فریب کا زہر پی چکی ہے۔ کاش.......میرے دل میں نت نئی امنگوں کو اپنا لینے کی کمزوری نہ ہوتی.........کاش.......میں جھوٹے ساتھیوں کے بہکاوے میں نہ آ جایا کرتا.......مطلبی ساتھیوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا مگر جاتے جاتے اپنی لعنتیں میرے پھٹے ہُوئے دامن

ں پھینک گئے۔.......... میں شرابی ہو گیا...... میرے منہ سے
لتی ہوئی زہریلی بدبُو نے میرے ماں باپ کی عمروں کو جھلس دیا۔ وہ....
مجھے چھوڑ کر چلے گئے......... مگر میں شراب کو نہ چھوڑ سکا۔ اب میری
جیب میں پیسہ نہیں ہے۔ شراب کی طلب میری ہر قسم کی مجبوریوں کو ٹھکرا
ر مجھے ہر گناہ کو اپنا لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس بہتی ہوئی آگ نے میرے
پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ارادوں کو گنگا سے بھی زیادہ پوتر قسموں کو
بھسم کر دیا ہے......... میں جانتا ہوں کہ نرک کی خونخوار لپٹیں۔
میرے راستہ کی منزل ہیں......... مگر میں کیا کروں......... آج
شراب کے ایک گھونٹ کی خواہش نے مجھے اپنے دیئے ہوئے تحفے
تمہارے ہاتھوں سے چرا کر......... شراب خانہ کے ٹھیکیدار
کی تجوری میں ڈال دینے کے لئے مجبور کر دیا...... کاش مجھے وہ دوست
بھی نہ ملے ہوتے......... جو مجھے دوزخ کی گہرائیوں میں پھینک کر
جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ چمپا نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔"آپ شانتی
رہیں ناتھ......... میں نے سُنا ہے پسچیتاپ کی اگنی بڑے سے بڑے
گناہ کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔
۔ برج نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا"مگر یہ سرخ رنگ اتنی تیز ہے کہ چمپا کہ پسچیتاپ کو بھی جلا کر
راکھ کر دیتی ہے" چمپا نے جواب دیا"آپ اپنے ان ارادوں کو مضبوط بنائیے"
برج نے کہا۔"کتنے مضبوط تھے میرے ارادے...... مگر..... چمپا
.... تم میری کہانی سنو...... میں جب ایف اے پاس
کرنے کے بعد کالج میں گیا مجھے بورڈنگ ہاؤس میں دو دوست مل گئے۔ ایک
ان میں اچھا ستار بجانے والا تھا اور دوسرا ایک ادھورا شاعر تھا۔ اُن کی

رنگین باتوں نے میرے معصوم دل کو گناہ کی دلفریب جھلکیں دکھائیں اور پھر ایک دن .... کالج کی چھٹیں تھیں ۔ پتا جی بیمار تھے ۔ اُن کی تار پر تار آ رہی تھی مگر میں رتن اور سریش کے ساتھ گلچھرے اُڑا رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور رات کو ہم لوگ ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے تھے .....

رتن ستار بجا رہا تھا ۔ ستار کے نغمے ختم ہوئے اور سریش نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "رتن سنگیت اور سرور کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ رتن نے کہا" ارے ہاں ! میں بھول ہی گیا تھا .... آج میں بیر Beer کی ایک بوتل لایا ہوں ۔

شاید میرے لہجے میں میرے خاندان کی شرافت سسکی جیب میں نے کہا "کیا ؟ سریش نے کہا ۔ گدھے ہو برج .... یہ زندگی بار بار نہیں ملتی .... یہ فرصت و گناہ خدا بڑی منتوں کے بعد انسان کو عطا کرتا ہے ۔

میں نے کہا مگر میں نہیں پیونگا"

سُریش کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رتن نے آتے ہوئے کہا ۔ ابے Beer ہے یہ جو کا پانی ہے ۔ شراب نہیں ۔ یہ گرمیوں ہی میں بہار دیتی ہے ۔ ہاضمہ درست کر دیتی ہے ۔ میں نے پھر کہا "آپ لوگوں کا ساتھ میں اس معاملے میں نہ دے سکوں گا"

سریش نے پھر کہا "تمہاری جان کی قسم یہ جو کا پانی ہے اور صحت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے ۔ کون انگریز ہے جو اس کو نہیں پیتا ۔ اور اس کی برکت سے لال چقندر بنا نہیں گھومتا ۔

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا ۔

سریش نے Beer سے گلاس بھرتے ہوئے کہا ۔ "تو تمہیں قسم ہے پیو ۔

میں اُن کے اصرار کے آگے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور میں نے وہ Beer کا گلاس پی ہی لیا........ دوزخ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ ہر محفل بغیر Beer کے سونی سونی معلوم ہوتی تھی۔ Beer کے دو گلاس میرے گلے سے نیچے اُترتے تھے مگر نغمے رمن کی ستار کی تاروں میں انگڑائیاں لینے لگتے۔ سریش کے ٹوٹے پھوٹے اشعار جاندار اور درد انگیز ہو جاتے۔ تفریح عادت بن گئی اور کچھ ہی عرصہ بعد Beer ۔ جَو کا پانی سادہ پانی سے زیادہ پھیکا ہو کر رہ گیا۔ اُمنگیں اب ایک قدم آگے بڑھنا چاہتی تھیں۔ اور پھر وہ دن بھی آیا کہ Beer کی جگہ ہماری محفل میں وہسکی whisky کی بوتل رکھی تھی۔ پتا جی اپنے پیٹ کو گانٹھیں دے کر روپیہ بھیج رہے تھے اور میں بڑے امتحان کی تیاری کا بہانہ کر کے رُوح کی دوشیزگی کو ساغروں کی کھنک میں ڈبوتا چلا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ہر شام کی آمد شراب کی طلب کا پیغام لے کر آنے لگی.... اور میں اچھا خاصہ شرابی بن گیا۔ پتا جی کا تار پہ تار آ رہا تھا مگر میں اُن کی محبت تو در کنار اس محبت کی یاد کو بھی پیالوں میں ڈبو چکا تھا۔ اور پھر whisky کچھ ایسی بُری طرح منہ لگی کہ اس کی بوتل ہر وقت ہی آنکھوں کے سامنے رہنے لگی.. .... اب گھر سے آئی ہوئی چٹھیں اور تاریں میں بغیر پڑھے ہی کمرے میں اِدھر اُدھر لاپرواہی سے پھینک دیتا........ ایک شام حسب معمول چھت پر شراب و سرور کا دور دورہ تھا۔ رمن نے شراب کے لطف کو پوری طرح اُٹھانے کے خیال سے کچھ نمکین بھی منگوایا تھا۔ میں دوڑ کر کمرے سے ایک کاغذ اُٹھا لایا تھا۔ اس پر نمکین رکھ دیا گیا تھا۔ شراب کا دور چلتا رہا۔ .... دَور پہ دَور........ آخر محفل ختم ہوئی مگر میں ابھی پوری طرح مدہوش نہ ہُوا تھا........ سریش جھوم جھوم کر گا رہا تھا ؎

"یہ عالم بنا لے ارے گرنے والے
کہ ہر گام پر تجھ کو ساقی سنبھالے"

اچانک میری نظر اس کاغذ پر پڑی جس پر نمکین کھا ہوا تھا یہ تار کا کاغذ تھا
میں نے پڑھا اس پر لکھا تھا" پتاجی سرگباش ہو گئے ہیں"
میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں گھبرایا..................
تعلیمی سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ گھر پر میرے سوا اور کوئی بھی نہ تھا.....
ماں پتاجی کے دیوگ میں رو رو کر اندھی ہوئی جا رہی تھی......کبھی کبھی وہ انتہائی درد انگیز لہجہ میں رو کر بیان کریں کہ پتاجی کے کیسے میرا انتظار کرتے کرتے راہی ملکِ بقا ہوئے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو شراب بند رہی۔ مگر چند ہی مہینوں کے بعد چنگاری پھر سلگ اٹھی اور خرمنِ عقل و ہوش کو جلانے لگی۔ اب اگرچہ میں گھر پر رہ کر اپنے زمیندارے کام کاج کی دیکھ بھال کرتا تھا اور شہر کی رنگین دُنیا سے دُور تھا۔ مگر ہوسٹل کی زندگی کی چند روزہ رنگینیاں دل و دماغ پر اس قدر اثر کر چکی تھیں کہ وہ نشہ جسے میں مرتے ہوئے باپ کی تمنائے دیدار کا گلہ گھونٹنے والا سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ٹھوکر مار چکا تھا......پھر میری رُوح اور میرے ارادوں کو للکارنے لگا.........میں پھر پینے لگا۔ انجام سے بے خبر ہو کر پینے لگا۔ بھولی بھالی ماں مجھے زندگی بھر معصوم ہی سمجھتی رہی..........مردانہ میں روز شراب کی محفل گرم ہونے لگی۔ رمن کی جگہ اب بنواری لال تھا۔

ماں کو ہر وقت یہی فکر رہتی تھی کہ میری چھوٹی بہن شانتا کی شادی جلد از جلد کر دی جائے تو بہتر ہے۔ مگر میری ذمہ داریاں پیالیوں کی لہروں میں غرق ہوتی جا رہی تھیں۔ سریش نے مجھے بیئر Beer کا فریب دیکر وِسکی Whisky

تک پہنچا دیا تھا۔ اور زمینداری مجھے دِسکی ہسکی کے ہمراہ خورشید طوائف کے یہاں لے پہنچا۔۔۔۔۔۔۔ اب تک زمینداری کی جو کمائی گھر کے خرچ پر صرف ہوتی تھی اب وہی کمائی خورشید کے نغموں اور اس کے ناز و انداز کی نذر ہونے لگی۔ ماں اور بہن کے اُجلے کپڑے۔۔۔۔۔۔۔۔ میلے ہوئے۔۔۔۔ پھر پُرانے ہوئے اور آخر بوسیدہ ہو کر تار تار ہونے لگے۔۔۔۔۔ اور خورشید کے ملنموں کے زیورات کی جگہ چاندی کے زیورات نے لے لی اور پھر چاندی کے جگہ سونے کے زیورات لے لی۔۔۔۔۔۔۔۔ میری دُنیا۔۔۔۔۔۔ اور میری دُنیا کی تمام رنگینیاں شراب کی سُرخی میں رنگ کر خورشید کی ذات کے گرد حلقہ بن کر رہ گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ماں کو آخر میری حرکتوں کا پتہ چل گیا۔۔۔۔۔۔ وُہ چیخی۔۔۔۔۔۔۔ وہ چلاّئی۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے منت خوشامد کی۔۔۔۔۔ اور پھر اپنے بڑھاپے اور اپنے دودھ کا واسطہ دیا۔ مگر میں خورشید کے خیال کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنا چکا تھا۔ ماں کا اُترا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے اور مرجھاتا جا رہا تھا۔ مگر میں ہر خیال اور ہر بات سے بے نیاز ہوتا چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ایک دن میں خورشید کو اپنے گھر لے آیا۔ ماں نے فیصلہ دیا۔ اور کہا "برج اگر تم اِسے اس گھر میں رکھنا چاہتے ہو تو مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے منہ پھیر کر جواب دیا "ہاں ماں! تمہیں اب یہ گھر چھوڑنا ہی پڑے گا" ماں نے کہا "شانتا کا کیا ہوگا۔ یہ بھی سوچ لیا ہے۔؟

"شانتا کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ"۔۔۔۔۔ میں نے بے پرواہی سے جواب دیا
ماں بولیں "مگر اس کی شادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
میں نے بات کاٹ کر جواب دیا۔۔۔۔۔ "ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔

ماں نے گھر چھوڑ دیا........ اور وہ اس کچے مکان میں چلی گئی جس میں ہمارے مویشی بند ھتے تھے........ دُنیا چیخی..... سماج چلّایا........ پڑوسیوں اور رشتہ داروں میں چہ مئہ گوئیاں ہوئیں..... مگر شراب نے میرے کان قطعی بند کر دیئے تھے.......... آہستہ آہستہ زمینداری بکنے لگی........ مفلسی منہ کھولے میری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی........ میں اب ماں سے زبردستی چھین کر زیور بھی شراب اور خورشید کی نذر کرنے لگا۔ میں نے ماں سے وہ زیور بھی چھین لیئے جو اس نے شانتا کی شادی کے لئے بنوائے تھے....... جب کچھ بھی نہ رہا...... زمینداری بک گئی۔

گھر کے نوکروں اور گماشتوں کی جگہ گھر کے دروازے پر قرض دینے والے ساہوکاروں کی بھیڑ جمع رہنے لگی تو خورشید بھی بنواری لال کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں دُنیا میں اکیلا رہ گیا...... آخر ماں کا دل تھا........ ماں نے پھر مجھ ناکارہ بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔

شرابی کی بہن سے کون شادی کرتا........ شرابی کو کون اپنی بیٹی دیتا........ میں تو کنوارا تھا ہی معلوم ہوتا تھا شانتا کو بھی ور نہیں مل سکے گا۔

شراب نے میری رگوں سے لہو نچوڑ لیا تھا....... میرے جسم میں محنت کرنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی........ میرے دماغ سے سوچنے کی صلاحیت جاتی رہی تھی۔ میری ہمت جواب دے چکی تھی میرے حوصلے مردہ ہو چکے تھے........ مگر روپیہ کمانا ضروری تھا..... اور شراب کی طلب اب بھی جان کو نوچ نوچ کر کھا رہی تھی.... Whisky

سے عُمرہ پر نوبت آگئی تھی ...... مگر عُمرہ کے لئے بھی تو پیسوں کی ضرورت ہے .... میں جوئے کی طرف رجوع ہُوا - اور چمپا میں تم سے جھوٹ نہیں بولونگا .... جوئے سے بھلا کبھی گرہستی کے خرچ چلے ہیں - میں گرہ کٹ بن گیا .... میں نے جیبیں کاٹیں ...... چمپا جیبیں .... اور پھر ایک دن میں اس جرم میں گرفتار ہوگیا - مجھے آٹھ مہینے کی سزا ہوئی - اگر شراب میری انسانیت کو نہ خرید لیتی تو کیا کبھی میں وہ دن بھول سکتا تھا کہ جب مجسٹریٹ کے فیصلہ سنانے کے بعد پولیس مجھے ہتھکڑیاں ڈال کر جیل خانہ کی طرف لئے جا رہی تھی - .... "میرے برج کو چھوڑ دو .... میرے بیٹے کو چھوڑ دو - میری بوڑھی ماں سر پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی - اس کے بغیر ماں اور بیٹی کا کوئی سہارا نہیں ہے - یہی ہم بے آسروں کا آسرا ہے - میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ یہ اب کبھی گناہ نہیں کرے گا - یہ اب کیوں کر گناہ کر سکتا ہے کیا شانتا کے کنوارے پن کی لاج کا دھیان بھی اسے نہیں آئے گا .... پولیس والے مجھے لئے جا رہے تھے اور ماں پکار پکار کر کہہ رہی تھی" آجاؤ ... برج .... آجاؤ .... بیٹا تمہارے بغیر میں ایک پل نہیں جی سکوں گی - تمہارے بغیر میری جوان بیٹی کی سدھ کون لے گا - مگر قانون کے فولادی ہاتھوں نے میری بوڑھی ماں کی سب التجاؤں کو ٹھکرا کر مجھے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا -

میں جیل سے رہا ہو کر آیا .... ماں نیم پاگل ہو رہی تھی - وہ رو رو کر کہہ رہی تھی - بیٹا تمہارے بعد اس دُنیا میں ہماری ردیوں کا کوئی سہارا نہ تھا - بیٹا میں اور شانتا تمہارے ننہال جا رہی تھیں - ریل کا

سفر کرنے کے لئے ہمارے پاس پیسے کہاں تھے - بنواری لال نے اپنی بیل گاڑی میں ہمیں تمہارے نانا کے گھر پہنچانے کا وعدہ کیا - ہم اس کی گاڑی میں سوار ہو کر چل دیئے - مگر آہ ...... مجھے کیا خبر کہ بھگوان کے بھیس میں ہمیں شیطان ملا ہے - جب ہم جنگل میں سے گذر رہے تھے تین چار آدمیوں نے ہماری گاڑی گھیر لی - بیٹا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ سب بنواری لال کے ساتھی تھے .... بنواری لال دُور کھڑا ہنس رہا تھا - انہوں نے مجھ بُوڑھیا کو گاڑی کے ساتھ باندھ دیا اور میری بھولی بھالی بیٹی شانتا کی آبرو بگاڑنے پر اُتر آئے - اس نے ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑے - پیر پکڑے مگر وہ خونی بھیڑیئے ہنس رہے تھے - میری بیٹی کی بے بسی پر ..... اُنہوں نے اس کے سر کا دوپٹہ اُتار کر پھینک دیا - لاچاری اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بن کر ٹپک پڑی .... میرے سامنے ہی اُن بدکاروں نے میری بیٹی کو ناچنے کے لئے کہا ...... مگر بیٹا جس معصوم لڑکی نے کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھا ہو وہ بھلا اُن کے سامنے بے شرم ہو کر کیا ناچتی - وہ خاموش کھڑی رہی .... بنواری لال نے اس کے منہ پر کھینچ کر طمانچہ مارا اور کڑک کر کہا ...... ناچ ورنہ ہم تیری ماں کو قتل کر ڈالیں گے ...... میری گائے جیسی بیٹی شانتا نے سسک سسک کر کہا - میں ناچتی ہوں - میری ماں کو قتل نہ کرنا - جب سے بھیّا قید ہوئے ہیں میری ماں بہت دُکھی ہے - اور یہ کہہ کر وہ ناچنے کی کوشش کرنے لگی - اور پھر جب اُس نے دیکھا کہ بنواری لال حد سے زیادہ بڑھنا چاہتا ہے تو وہ جنگل میں ایک طرف بھاگ نکلی - میری بھولی بیٹی خوفزدہ ہرنی کی طرح بھاگی ...... برج ! بنواری لال بھوکے شکاری کتے کی طرح اس کے پیچھے دوڑا ...... تو وہ پھر جانتے ہو - بیٹا !

شانتا مجھ ابھاگن کو بلکتی چھوڑ کر ایک اندھے کنوئیں میں جاگری۔
میں نے بے تابی سے پوچھا "بنواری لال کہاں ہے ماں......
میں ایک بار پھر جیل جاؤں گا۔ ماں نے کہا" وہ تو ہمیرپور میں ڈاکہ ڈالنے کے جرم میں پہلے ہی سات برس کے لئے جیل جا چکا ہے.........
میں انتقام کے جذبے کی آگ کو دل کی گہرائیوں میں دبا کر رہ گیا۔
آخر روزگار کی تلاش میں مَیں ماں کو چھوڑ کر شہر آ گیا۔ جیل کاٹنے کی وجہ سے سرکاری دفتر میرے لئے بند ہو چکے تھے۔ میں نے ایک کارخانہ میں مزدوری کر لی۔ وہاں میں نے دیکھا دن بھر خون پسینہ ایک کر کے مزدور اپنی کمائی کا بیشتر حصہ شراب کی نذر کر رہا ہے.......... میں چلا چلا کر کہنا چاہتا تھا......... کہ اس ظالم شراب نے میرے باپ کی جان لی ہے۔ میری بہن کو ختم کیا ہے۔ مجھے لکھ پتی سے مزدور بنا دیا ہے......... مگر مزدوروں کی یہ دلیل کہ سیٹھ کے کارخانے کی چکیوں میں پستی ہوئی ہڈیوں کو زندہ رکھنے کے لئے اس زہر کو پینے کی ضرورت پڑتی ہے میری زبان بند کرا دیتی تھی۔ میں لاچار خاموش ہو کر رہ گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کچھ روپئے کمائے...... میں گاؤں دوڑ آیا اور میں نے اپنی زندگی کی پہلی کمائی ماں کے قدموں پر رکھ دی......... بجھتی ہوئی آنکھوں کو اُمید کا نور مل گیا۔ میری بھولی ماں نے مجھے یہ کنگن دیتے ہوئے کہا۔ برج! میں نے یہ کنگن سب مصیبتوں سے بچا کر اپنی بہو کے لئے رکھا ہے۔ تم اِسے اپنی اِستری کو دینا......... میرے پران نہ جانے کب نکل جائیں......... میں نے کنگن لے لیا۔
مَیں شہر لوٹ آیا......... اس بار مجھے معلوم ہوا کہ جس کارخانہ میں مَیں کام کرتا ہوں۔ اس میں میرے پرانے کالج کے دوست سریش کا

حصہ ہے۔ اُسے معلوم ہُوا تو اُس نے مجھے مزدوروں سے کلرکوں میں رکھ لیا .... میرے دن پھرنے لگے۔ مگر روپیہ ملتے ہی اور سریش کی پرانی صحبت زندہ ہوتے ہی پھر شراب کے جام میرے سامنے آ گئے۔ اور میں پھر شرابی ہو گیا۔ میری پوزیشن کچھ بن چکی تھی اس کے بعد تمہارے پتاجی نے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کیا۔ اس دن مَیں شراب پی کر یہ خوشخبری اپنی ماں کو سنانے کے لئے گاؤں چل دیا .... گاؤں میں آ کر میں نے دیکھا ماں کی چتا جل رہی تھی۔

میری تمہاری شادی ہو گئی .... پھر تم جانتی ہو سریش نے مجھے ذرا سی بات پر کارخانہ سے علیحدہ کر دیا۔ تب سے آج تک بے کار ہوں۔ دل شراب مانگتا ہے۔ پیٹ روٹی چاہتا ہے۔ مفلوج دماغ روٹی کو الگ پھینک کر شراب کی طرف جھپٹتا ہے اور آج .... آج میں جانتا ہوں گھر میں تین دن سے فاقہ ہُوا ہے۔ گناہوں کی بھٹی روح کو پھونکنے کے لئے شراب کا ایندھن چاہتی ہے .... میں نے مرحوم ماں کی تمناؤں کی آخری نشانی یہ کنگن بھی چُرا لینے کی کوشش کی .... چمپا تم میرے منہ پر تھوکو میں بے شرم ہوں۔

چمپا نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا .... ناتھ! جس شراب کو باپ کا بلیدان۔ بہن کی لاش۔ ماں کی چتا نہ چھڑا سکی۔ اِس کو میں کیسے چھڑا سکوں گی۔ گناہ کو گناہ سمجھ لینے کے بعد بھی اگر انسان گناہ کرے تو اس کا علاج سوائے دیوتاؤں کے اور کِسی کے پاس نہیں ہے ....

برج نے روندھے ہوئے گلے سے کہا" میں اس دیوتا کے قدموں میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ جو میری روح کو اس بہتی ہوئی آگ سے نکال لے۔

چمپا نے اُفق کے اس پار دیکھتے ہوئے کہا "پتا جی کہتے تھے۔ یُگ کے مہا پرش باپُو نے شراب کو زہر بتایا ہے۔ .... وہ کہا کرتے تھے۔ شراب منشیہ سے منشیہ کی منشیتا چھین کر اُسے پشو بنا دیتی ہے۔

برج نے کہا! سچ مچ پشو بنا دیتی ہے۔

چمپا نے کہا۔ وہ بھارت میں اس وقت آئے جب دیش پر واستا اور ظلموں کی گھور گھٹائیں گرج رہی تھیں .... دیش باسی انگریزوں کی غلامی پر فخر کر رہے تھے .... وہ میدان میں اُترے ...... اہنسا کا دیپک لے کر .... انہیں مصیبتوں نے گھیرا .... انہیں ظلمتوں نے للکارا ... ... مگر وہ بدھ کی طرح شانت اور ہمالیہ کی طرح اٹل آگے بڑھے .... غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی بھارت ماتا کی بندھن کی بیڑیاں کاٹنے کے لئے۔ اپنوں نے انہیں گالیاں دیں۔ باہر والوں نے اُن کا مذاق اُڑایا اور حکام نے انہیں کتنی ہی بار جیل میں ڈالا۔ مگر ماں کا وہ نہاں بھگت دیش پریم میں متوالا اپنی راہ سے نہ ڈگمگایا۔ اس نے ہمارے لئے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں۔ اس کے پیارے ساتھی جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔ اس کے مددگار گولی سے اڑا دیئے گئے اس کی پریہ پتنی نے جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے سائے میں دم توڑ دیا مگر اس کی ہمت میں پستی نہ آئی .... اور جب اس کی اُمیدوں کے پھولوں کے لہلہانے کا وقت آیا اور جب اس کی آرزوں کی کلیاں ہنس کر پھول بننے والی تھیں .... نادانوں نے بدلیغیوں کے جھگڑے میں آکر آپس میں لڑنا شروع کیا۔ باپُو کے سپنے بکھرنے لگے .... وہ نواکھلی بھاگے .... کٹھن راہیں۔ بھیانک جنگل .... اونچے اونچے پہاڑ۔ طوفانی ندیاں .... کانٹوں سے بھرے راستے کچھ بھی تو اُن کو نہ روک سکے۔ وہ

آپس میں پریم کرنے کا پیغام لے کر وحشیوں کی دُنیا میں اکیلے آگے بڑھے
...... اور شانتی کی ستھاپنا ہوئی - اسی دوران میں باپو کا شبھ اُن کے
پرشار تھے نے ستیہ کر دکھایا - اور جب ماں کے بندھن ٹوٹے ...... ابھی
دیش باسی اُن کے چرنوں میں اپنا پریم بھی ارپن نہ کرنے پائے تھے کہ ایک
گمراہ انسان نے انہیں ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا کر دیا..... وہ جیئے
ہمارے لئے ...... اور مرے بھی ہمارے لئے ..... وہی باپو کہا
کرتے تھے - بھارت باسیوں کے لئے شراب زہر ہے ..... اتنے بڑے
مہاپرش کو دیش شردھانجلی ارپن نہیں کر سکا .... ہم رہتی دُنیا تک
کلنکیت کہلائیں گے - اگر ہم نے اُن کے واکیوں کو ستیہ مان کر اُن پر عمل نہ
کیا .... وہ کہتے تھے شراب زہر ہے .... اس کا استعمال
مُنش کو پشو بنا دیتا ہے .... کہتے کہتے چمپا خاموش ہو گئی۔......
برج نے کہا "چمپا یہ کتھا بند نہ کرو - مجھے اس کتھا کو سُن کر ایک بیکار کا
آتمک بل مل رہا ہے .... ہاں اور کیا کہا کرتے تھے باپو ....
چمپا نے کہا "وہ کہتے تھے شراب زہر ہے .... شراب مُنش کو ننگا کر دیتی
ہے اور دیش باسیوں کا ننگا پن ہی ماں کو غلامی کی بیڑیاں پہناتا ہے -
برج سوچ میں پڑ گیا - وہ بولا ...... چمپا تم میرے ساتھ چلو ..... آج
میں تمہارے ساتھ شراب پیونگا
چمپا سُن کر ہکی بکی رہ گئی ....
مگر برج اصرار کر کے اندھیرے راستے میں چمپا کو ساتھ لے چلا ...... چلتے
چلتے وہ کانگریس کمیٹی کے دفتر کے سامنے آ کر رُکا .... دفتر بند تھا -
دفتر کے باہر پوسٹ مارک کوش رکھا تھا ...... برج نے چمپا سے کنگن لے کر اس

میں ڈال دیا....... وہ بولا آج میں نے بوتلوں کی شراب چھوڑ کر ایک ایسا امرت پیا ہے جس کا نشہ مجھے جیون بھر رہے گا-........

دور کسی مندر میں کیرتن ہو رہا تھا

رگھوپتی راگھو راجہ رام

پتیت پاون سیتا رام

دو آنسو

شفق پر سونے کا سُرخ چشمہ اُبل رہا تھا...... سورج کو رات کی دلہن کے دلوالوں میں داخل ہوئے کچھ لمحات ہی گذر رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم ہونے کے باوجود ہوا میں قدرے خنکی تھی۔ شام کے جھینے جھینے دھندلکے گنگا کی شفاف لہروں پر اپنا سرمئی آنچل ڈالنے لگے تھے۔ رات رانی مشک پاشی کی تیاری میں مشغول تھی......... ساحل کے ٹوٹے پھوٹے گھاٹوں پر پجاری پوجا کی طشتریاں اور تھالیاں صاف کر رہے تھے۔ اور وہ دونوں اُس پرانے بنگلہ کی چھت سے آرام کرسیوں پر بیٹھے شام کے اندھیرے میں غرق ہونے والے مندر کے گنبدوں اور پرانے قلعہ کی اٹاریوں کو دیکھ رہے تھے۔ کھنڈر کی دُنیا میں وہ دونوں کسی عہد پارینہ کی یادگار معلوم ہو رہے تھے........ دونوں ہی بُوڑھے ہو چکے تھے.... میاں بیوی دونوں ہی........ اور سال ہا سال سے جیون کو ایک ہی دھار میں بہاتے بہاتے دونوں کے خیالات........ دونوں کے تخیل .... دونوں کے احساس ہم آہنگ ہو گئے تھے۔

دونوں اس قصبہ میں آئے تھے........ چند دنوں کے لئے..... شہر کے پُر شور ہنگاموں سے اُکتا کر....... سکون کی تلاش میں.....

سیٹھ کشن لال کے ہونٹ پھڑپھڑائے اور ساوتری اپنے خاوند کی بات سُننے کے لئے چوکنی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایسی باتیں ساوتری روز ہی سُنتی تھی مگر آج سے سیٹھ کی باتوں میں ایک ایسی تبدیلی نظر آرہی تھی۔

جو اس کی سمجھ سے باہر تھی اور اسی لئے وہ کچھ کچھ پریشان بھی تھی۔۔۔۔۔ بغیر کچھ کہے سُنے وہ سیٹھ کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ الفاظ کانوں میں رینگنے لگے۔۔۔۔۔۔ ساوتری! سوامی آتمانند بڑے اچھے مہاتما ہیں۔ اُن کے چہرے پر شانتی کا نور برستا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں بھگتی کی چمک ہے۔ اُن کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے سکون بھی ملتا ہے۔ مگر۔۔۔۔۔"

ساوتری آتمانند کے بارے میں سیٹھ جی کے منہ سے "مگر" سُن کر حیران سی رہ گئی ایک دو برس نہیں پورے چھبیس برس سے سوامی آتمانند سیٹھ جی کے گورو چلے آرہے تھے۔ آج سے چھبیس برس پیشتر گورو پورنما کے دن اسی قصبہ میں اسی گنگا کے کنارے جب سورج سفید لہروں میں غسل کرنے کے بعد آسمان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اور ساحل کے کنارے لگے ہوئے پھولوں پر آراستہ شبنم کے رخساروں میں نوزائیدہ کرنیں رنگ بھر رہی تھیں اور دور ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں کو کھیتے۔ لہروں کو گدگداتے مچھلیاں پکڑنے چل پڑے تھے۔ سیٹھ جی نے سوامی آتمانند کے پاؤں کے داہنے انگوٹھے کو دھو کر اس کا چرن امرت لیا تھا۔ اُس دن سے آج تک سیٹھ جی سوامی جی کی شخصیت میں نورِ حقیقی کی پوجا کرتے چلے آ رہے تھے۔ اُنہی سوامی آتمانند کے بارے میں آج سیٹھ جی کے منہ سے "مگر" سُن کر ساوتری بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ اُس نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

"مگر کیا"؟ سیٹھ کشن لال کی نگاہیں گنگا کے دوسرے پار کسی بجھتی ہوئی چتا پر جم گئیں۔ اُن کے اُلجھے ہوئے خیالات اُن کے گلے سے ایک گمبھیر اور باوزن آواز بن کر بکھرنے لگے۔ "مگر۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوامی آتمانند بغیر کوئی جنگ لڑے ہی فتح یاب ہو گئے ہیں"۔ سیٹھ جی

نے تاڑ لیا کہ ساوتری اُن کی بات کا مطلب نہیں سمجھی ہے۔ اسی لئے وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے "آتمانندجی بچپن ہی میں سادھو ہو گئے تھے۔ جوانی کو بے داغ رکھنے کے لئے وہ دُنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر دہرہ دُون کے جنگلوں میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ بڑھاپے کے ہمراہ روحانیت کا اتھاہ خزانہ لے کر لوٹے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ"........ سیٹھ جی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ساوتری نے بات کاٹی۔ گھبراہٹ خوف اور احتیاط اس کے لہجے میں کروٹیں لے رہے تھے۔ جب اُس نے کہا "آج آپ یہ کیا سوچ رہے ہیں؟........ آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ گورو کو بھگوان نہ ماننا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اور پھر گورو میں خامی دیکھنا تو بڑا پاپ ہے کہ جس کے لئے ہر بڑی سزا بھی چھوٹی ہے۔"

جلتی ہوئی چتا بجھتی جا رہی تھی مگر سیٹھ جی کی نگاہیں اب بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اور اُن کی آواز میں وہی بھاری پن تھا جب وہ بولے "ہاں میں ہی کہا کرتا تھا کہ گورو میں خامی دیکھنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ جس کی جتنی بھی بڑی سزا لے ناکافی ہے........ مگر ساوتری........ زندگی محض کھیل ہی نہیں ہے۔........ یہ پانی کا بلبلہ نہیں ہے...... یہ ڈھلتی ہوئی چھاؤں نہیں ہے........ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے........ اٹل سچائی ہے........ ایک امر گیت ہے۔ جس کو جذبات کی رَو میں نہیں بہایا جا سکتا۔ جس کو من گھڑت تہمات کی کھائیوں میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔"

بات بات پر نئی اُلجھن میں اُلجھتی ہوئی ساوتری محض اتنا بولی "آج آپ بہت پریشان ہیں۔"

سیٹھ جی کے لبوں پر پھیکی سی چاندنی میں ناچتی ہلکی سی مسکراہٹ کو ساوتری نہ دیکھ سکی مگر اس کے کانوں میں آتے ہوئے سیٹھ جی کے یہ الفاظ اُس کے دکھی دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔ "ساوتری آج میری پریشانیاں گھٹتی نظر آ رہی ہیں۔ آج مجھے دھوئیں سے بھرے ہوئے دھندلکے کے پیچھے ساحل کی ہلکی ہلکی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ تم میری باتوں کو سنو.........

ساوتری کچھ نہ بولی۔

مگر سیٹھ جی نے اپنی باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آتمانند جی جنگلوں کو چلے گئے........ وہاں گناہ اُن کا پیچھا نہ کر سکا۔ اسی لئے انہیں یہ نہیں معلوم کہ جب جوانی ہوس مجسّم انسانی شکل میں آکر کھڑی ہوتی ہے تو اس وقت کیسے کیسے معرکہ گرم ہوتے ہیں۔ یہ جوانی کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے کون کون سے جتن نہیں کرتی اور جوانی اپنے آپ کو بچانے کے لئے کبھی آگے بڑھتی ہے۔ کبھی پیچھے قدم ہٹاتی ہے کبھی چیختی اور کبھی گڑگڑاتی ہے۔ جو سپاہی خود کبھی میدان میں نہیں اُترا وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر جنگ میں اُلجھے ہوئے بہادر کو فتح کے نقشے نہیں سمجھا سکتا"۔

ساوتری سوچتے سوچتے بول ہی پڑی: "سیٹھ جی سال ہا سال کی مسلسل بھگتی نے آتمانند جی کو وہ طاقت دے دی ہے جس سے وہ دُور بیٹھے سب چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔"

سیٹھ جی بولے: "یہ ڈھکوسلہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سوامی آتمانند اس وقت میرے سامنے آجائیں اور میں کہہ سکوں" مہاراج آپ کا چھبیس

سال کا ایدلیغ میری زندگی کو سکون کا سایہ تک نہیں دے سکا ہے......
آپ نے میری آتما کی غلاظت دھوتے دھوتے میرے دماغ میں وہموں
کے اتنے جالے بھر دیئے ہیں کہ میری روح ان میں جکڑ کر رہ گئی ہے۔
اور سانس تک بھی نہیں لے سکتی۔
ساوتری نے ڈرتے ڈرتے کہا "بھول جائیے بیتی باتوں کو سیٹھ جی
چلیئے آرتی کریں"
سیٹھ جی کی نگاہیں اب بھی اسی چتا پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بجھتے بجھتے
اب بالکل ہی بجھ چکی تھی۔ دور کے مندروں اور نزدیک کے شوالوں سے
پجاریوں کے کیرتن اور گھڑیالوں کی ہلکی ہلکی صدائیں آنے لگی تھیں۔ سیٹھ جی کے
لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ وہ بولے "میں آرتی نہیں کروں گا۔ تم خاموشی
سے میری بات سنو۔"
ساوتری خاموش ہو گئی۔
سیٹھ جی بولے۔ "جانتی ہو لڑکا ہر دیپ اس قصبہ کا رہنے والا تھا۔
ساوتری بے چین سی ہو کر ابل پڑی۔ "پھر لے بیٹھے آپ اسی بات کو"
سیٹھ جی بولے۔ "خاموش رہو ساوتری۔ تم نہیں جانتیں۔ آج کل کے زمانے
میں باپ دادا کی امیری کا چراغ جلتا رکھنے کے لئے کتنے گھروں کے چراغ
بجھانے پڑتے ہیں۔ اور پھر باپ دادا کی دولت پر زیادہ دولت کے انبار
چننے کے لئے تو کتنی ہی کھلکھلاتی ہوئی پھلواڑیوں کو نوچ نوچ کر افلاس کی
بھٹی میں پھونکنا پڑتا ہے.......... آج دنیا کہتی ہے کہ سیٹھ
کشن لال جیسا دانی سیٹھ دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ سوامی آتمانند کہتے
ہیں کہ ان کے شششیہ سیٹھ کشن لال کی شرافت اور نیکی ان کی بھگتی سے

ی آگے نکل گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھے کلجگ کا جنک کہتے ہیں۔ مگر میں
ود کو جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کیا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مجھے معلوم ہے کہ مجھ میں کتنی شرافت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی نیکی ہے"۔
ساوتری روندھے ہوئے گلے سے بول پڑی "کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟"
سیٹھ جی کے لہجے میں کسی قسم کی ترشی نہیں تھی جب وہ بولے "تم میری
شریکِ زندگی ضرور ہو مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیوی شریکِ نفس نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نہیں میرے بارے میں خاک بھی علم نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنو جانتا ہو
جب پتاجی سرگباش کر گئے تھے تو وہ چار کارخانے چھوڑ گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
چچا زندہ تھے مگر اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چاہتے تھے
اپنے بھانجے کو متبنےٰ بنانا ۔ ۔ ۔ میری عمر کیا تھی کل بائیس برس کی نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
چچا بیمار ہوئے ۔ ہم انہیں اپنے گھر لے آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُن کی تیمارداری
میں دن رات ایک کر دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر چچا پر بے ہوشی کا عالم طاری
ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے رائے صاحب برجموہن لال بیرسٹر کو بلا کر چچا
کی وصیت لکھوائی ۔ اُن کے حصّہ کے چار کارخانے اپنے نام لکھوائے
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چچا بیچارے یہی سمجھتے رہے کہ وہ اپنے بھانجے کے نام '
جائیداد کو چھوڑ کر جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاد ہے نہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب
تک ہماری شادی ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس طرح مرتے وقت نیم بیہوشی
کی حالت میں چچا مجھے اپنا بھانجہ سمجھ کر گلے لگا لگا کر رو رہے تھے ۔ اور
میں اُن کے حصّے کے چار کارخانوں کا بھی مالک بن کر دعائیں مانگ رہا تھا
مر چچا اپنے بھانجہ جسے انہوں نے آخری وقت بلایا ہے اُسے ملنے سے
پہلے ہی دم توڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چچا مر گئے اور میں سب جائیداد کا مالک

بن گیا........ یہ ہے وہ سیٹھ کشن لال جس کو میں جانتا ہوں۔ تم نہیں جانتی ہو........ دُنیا نہیں جانتی ہے......... کوئی نہیں جانتا ہے.............. اُس کے بعد زمانہ نے مجھے کیا کیا نہ سکھایا .... حرص و ہوس نے کیا کیا سبق نہ دیئے۔ میرے دلالوں کا ایک گروہ بازار میں چاندی خریدنے نکلتا.......... چاندی کا بھاؤ چڑھ جاتا....... میرے دلالوں کا دوسرا گروہ چاندی بیچنا شروع کر دیتا......... اسی قسم کے اُتار چڑھاؤ کے لین دین میں نہ جانے میں نے کتنے ہی گھروں کے چراغ گُل کر دیئے........ لوگوں کی تجوریاں سے دولت ناچتی، جھنکاریں بلند کرتی میری تجوریوں میں جمع ہو جاتی........ پھر دھرم کھاتہ کے نام پر مزدوروں کی تنخواہوں سے فریب دے کر جمع کیا ہوا روپیہ....... ہر برس ایک نہ ایک مندر یا دھرم شالہ کی صورت میں جگمگانے لگتا......... ہر ایک بڑے شہر اور تیرتھ ستھان پر........ میرے سوامی آتمانند کہتے "میرا بھگت جہاں دانی ہے دُنیا کہتی ہے اس جیسا دھرماتما سیٹھ سنسار میں دوسرا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔..................

تمہیں نہیں معلوم........ تمہیں یاد ہے جب راج پیدا ہوئی تھی تو میں نے تمہیں ایک ہار دکھایا تھا........ اور تم اس ہار کو دیکھ کر مچل اٹھی تھیں۔ جانتی ہو وہ ہار کس کی کمائی تھا۔ ہمارے شہر کے وہ مشہور ہندی کوی تھے نہ دیپک......... انہوں نے اپنی کویتاؤں کی کتاب چھپوائی تھی......... وہ میرے پاس آئے اور وہی ہار... اپنی بیوی کا ہار میرے پاس سات سو روپے میں گروی رکھ گئے تھے۔

لکھائی پڑھائی انہوں نے کچھ بھی نہ کی .... انہیں مجھ پر ... مجھ
شہر کے جہادانی پر اعتبار تھا نہیں .... تمہاری پسند پر میں نے
وہ ہار تمہیں دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ روپیہ دے کر اپنا ہار واپس لینے
آئے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ بھئی تم نے ہار دیا ہی کب تھا ....
وہ بیچارا رو دھو کر چپکا واپس چلا گیا .... دُنیا بھلا اتنے بڑے
سیٹھ کو ہار کا چور سمجھ سکتی تھی .... جانتی ہو پھر کیا ہُوا .....
دیپک کی بیوی اسی ہار کے غم میں بیمار پڑ گئی اور آخر مر گئی ....
بیوی کے غم میں دیپک پاگل ہو گیا .... دُنیا نے نعرہ لگایا ....
سیٹھ کشن لال کی جے" .... سیٹھ کشن لال نے رام نگر میں کنواں
لگوایا ہے "سیٹھ جی بڑے دانی ہیں۔" دنیا کو کیا معلوم کہ رام نگر میں وہاں
کی زمین کو دُنیا کی نظروں میں مہنگی کرنے اور وہاں کی اپنی سستی خریدی
ہوئی زمین کو مہنگی قیمت پر فروخت کرنے کے لئے کنواں لگایا گیا ہے۔
ہم نے زمین دوسری جگہ خریدنی تھی نا ....

ساوتری سسک سی پڑی "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ
وہ ہار آپ نے اس طرح حاصل کیا تھا مجھے اگر یہ پہلے معلوم ہو جاتا تو
میں وہ ہار کبھی نہ پہنتی ...."

سیٹھ جی بولے "میری کیا کیا چیز لینے سے تم انکار کرو گی .... ساوتری!
ہمارے بنوائے ہوئے ہر شوالا ہر دھرم شالہ ..... ہر ہسپتال اور ہر
ایک گئو شالا کی بنیادوں کے نیچے تمہیں کیا معلوم کہ کتنے غریبوں کے ادھ
کھلے ارمان سسکتے ہیں۔ کتنے فاقہ کشوں کی آہیں اُن کے ملبہ کے ضمیر
میں دم توڑ رہی ہیں۔ ہر وہ لقمہ جو ہم کھاتے ہیں مظلوموں کی اُمیدوں

کے لہو سے لت پت ہوتا ہے ....

ساوتری نے ایسی نگاہوں سے سیٹھ جی کی طرف دیکھا جن میں بے چارگی اور پشچیتاپ کے ملے جُلے جذبے تیر رہے تھے۔ وہ رُک رُکتے رُکتے بولی "اِن سب باتوں کا آتمانند جی کو پتہ ہے؟ سیٹھ جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا" اگر جیسا کہ ہم لوگوں کا یقین ہے۔ اُن کے پاس وہ تیسری آنکھ ہے جو ہر چیز کے پوشیدہ راز سے واقف ہو سکتی ہے...... تو انہیں میرے اِن سب کاموں کا ضرور پتہ ہوگا.......... اور پھر اگر انہیں پتہ ہے تو وہ مجھے مہادانی اور نیک مشہور کر کے مجھے میرے گناہوں کو چھپانے میں ہی میری مدد نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ وہ میرے پاپوں کے حصہ دار بھی بنتے رہے ہیں۔

ساوتری کے لب و لہجہ میں خوف تھرتھرانے لگا۔ وہ بولی "آپ اپنے منہ سے یہ سب کچھ نہ کہیئے" مہاتماؤں کے بارے میں یوں سوچنا پاپ ہوتا ہے۔

سیٹھ جی کے لہجہ میں اس بار ہلکی سی تُرشی آگئی اور اُن کی آواز بھی قدرے بلند ہوگئی۔ وہ بولے "میں کیوں نہ کہوں یہ سب کچھ...... ہندوستان میں ہزاروں ایسے مہاتما بھگوان کے فرضی ایجنٹ بنے گھوم رہے ہیں۔ کیا فرق ہے اُن میں اور ایک نمائشی دوکاندار میں؟ نمائشی دوکانداروں کے پاس خوبصورت شوروم ہوتے ہیں جن میں دلکشی اور جاذبیت کے سامان رکھے جاتے ہیں۔ جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچ سکیں اور گاہک پر ڈاکہ ڈال سکیں.......... اور اِن نمائشی مہاتماؤں کا شوروم ہوتا ہے اِن کا چہرہ جس پر بھولاپن..... معصومیت..... اور

روحانیت کے لیے جُلے جذبات پیدا کرنے کی مبہم کوشش کی جاتی ہے ...... اِن کے گیروے کپڑے .... ان کا ترک اور تیاگ کا اپدیش .... اپدیش کے وقت اِن کا آنکھیں مُوند لینے کا انداز .... آہیں بھر بھر کر بھگوان کو پکارنے کی طرز کہ گویا یہی بھگوان کو جانتے ہیں ...... یہ سب اپنے چیلوں کے دلوں پر ڈاکہ ڈالنے کی چالیں ہوتی ہیں ساوتری .... اِن کی دوکان میں جاؤ اور اپنے ایمان اور محنت کی قیمت ادا کر دو۔ وہاں سے پاپ دھونے کا صابن مِل جائے گا۔ مجھے تو آج یہ حیرانی ہے کہ میں چھبیس برس تک اس گورکھ دھندے میں کیوں پھنسا رہا ....

ساوتری سوچتی رہی .... وہ کچھ نہ بولی۔

سیٹھ جی جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے ...... وہ بہتے رہے اُن کے جسم پر ایک ہلکی ہلکی کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں کو زور سے بھینچتے ہوئے بولے۔ میری اکلوتی بیٹی راج ...... کتنی تمناؤں اور دعاؤں کے بعد اس دیوی نے ہمارے گھر میں جنم لیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے سوامی آتما نند ہی کے آشیرباد کا پھل ہے۔ کتنے نازوں سے پالا تھا ہم نے اُسے .... ساوتری سچ کہنا ... کیا وہ ہماری لڑکی سورگ کی آتما نہ تھی ...... جو راستہ بھول کر ہمارے گھر آ گئی ہو ...... آخر چلی گئی .... نہ جانے کہاں چلی گئی وہ سورگ کی دیوی۔

ساوتری نے اُکتاتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔ "اب بھول جائیے نہ اس بات کو .... سیٹھ جی کے لہجہ میں اور زیادہ تُرشی آ

گئی وہ بولے ...... وہ باتیں جو میرے دماغ کا حصّہ بن چکی ہیں انہیں میں کیسے بھول جاؤں .... سیٹھ جی گویا بڑبڑانے لگے "ہردیپ کو ہم نے اس لئے ملازم رکھّا تھا کہ وہ راج کو مصوری سکھائے .... میں نے .... وہ اپنا نوکر تھا نہ رام آدھار ...... اُسے ہدایت کر دی تھی کہ ہردیپ اور راج کی دیکھ بھال رکھے .... اُس نے مجھے سب باتیں اس وقت بتائیں جب معاملہ بگڑ گیا ...... ساوتری جس نے رام آدھار کی وہ باتیں سُنی ہوں .... وہ کچھ بھی نہیں بھول سکتا ہے۔ ساوتری وہ باتیں سوامی آتمانند کے اپدیش سے کہیں زیادہ گہری اور کہیں زیادہ اٹل ہیں۔

ساوتری نے پوچھا۔"کیا بتایا تھا رام آدھار نے"؟

سیٹھ جی نے کچھ بھی جواب نہ دے کر سوال کیا" تم دھیریہ سے سُن سکو گی"؟

ساوتری بولی" آپ کہیئے تو"

سیٹھ جی بولے۔ ہردیپ کتنا شانت۔ کتنا گمبھیر ...... کتنا کم بولنے والا لڑکا تھا ...... کسی نے اس کا قہقہہ نہیں سُنا تھا .... تم تو ہمیشہ زنانہ میں رہتی تھیں ...... کاش تم نے اسے کبھی دیکھا ہوتا .... ہم لوگ جس سال حیدرآباد گئے ہیں .... ہم نے اجنتا کی وہ غاریں دیکھی تھیں نہ۔ اُن غاروں میں وہ تیکھی تیکھی چتون ... بڑی بڑی آنکھیں والے سُبک سُبک سے نوجوان دیکھے تھے نہ۔ تصویروں کے رُوپ میں ...... بالکل ویسا تھا ہردیپ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اجنتا کے پتھروں سے اُبھر کر یا اندر پوری سے کوئی دیوتا ہردیپ بن کر آگیا

ہے۔ اس کی لمبی لمبی پتلی انگلیوں میں فن کے کتنے خزانے دفن تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں مشاہدہ کی کتنی گہرائیاں تھیں .... تصویر بنانے والا خود ایک مجسم تصویر معلوم ہوتا تھا۔ رام آدھار بتا رہا تھا کہ کافی دنوں تک ہردیپ چُپ چاپ آتا رہا اور راج کو اپنا فن سکھانے کے بعد خاموشی سے چلا جاتا رہا ...... رام آدھار نے بتایا تھا کہ ...... ایک دن راج کنویس پر بکھری ہوئی قوسِ قزح کو دیکھنے کی بجائے ہردیپ کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی تھی..... اور ہردیپ بُرش تپائی پر رکھتے ہوئے بولا تھا "کیا بات ہے راج؟

راج کچھ نہ بولی۔

ہردیپ نے پھر پوچھا۔ "تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔

راج پہلے تو چُپ رہی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ پروفیسر صاحب! آپ اتنی خوبصورت تصویریں کیسے بنا لیتے ہیں۔

ہردیپ کی آواز میں...... خلوص ...... پختگی ...... اور سنجیدگی سب کچھ ہی تھا جب اُس نے راج کی طرف تیز تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "راج فن کے راستے میں بہت سے خوشنما نظارے آتے ہیں۔ فن کاری کا پجاری اگر اُن کے نظارے ہی میں اُلجھ جائے تو وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

راج نے آہستہ سے کہا "پروفیسر صاحب میں نے بہت کچھ سوچا" ہردیپ نے پوچھا۔ "کیا سوچا ہے تم نے؟"

راج نے کہا "قدرت کی خوبصورتی کو دماغ سے نکالنے کیلئے دل کا آئینہ بہت صاف ہونا چاہیئے۔"

ہردیپ نے بلند آواز سے کہا۔ "راج"

راج سہم کر ہردیپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

ہردیپ کی آواز سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہو گئی جب اُس نے کہا۔ راج فن کار کے لئے جذباتی ہونا ضروری ہے مگر اس کے جذبوں کو سوائے اُس کے فن کے کسی دوسری طرف نہ بہنا چاہیئے۔

راج محض مُسکرا دی۔

ہردیپ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔ "کیوں..؟ کہو؟

راج نے جواب دیا...... سمندر پر کون بندھ باندھ سکا ہے پروفیسر صاحب۔ زمین کو کس نے تولا ہے۔ اور تاروں کی گنتی کون کر سکا ہے

ہردیپ سوچ میں پڑ گیا........ اور پھر اس کے تمام احساسات اس کے ماتھے پر سلوٹیں بن کر نمودار ہو گئے وہ بولا۔ مگر اُس دریا کو جو آخر سمندر بنتا ہے، بندھ لگا کر تو باندھا جا سکتا ہے۔ راج کے ہونٹوں پر تبسّم کی کرن لہرا گئی۔

اُسکی نقرئی آواز جھنک اُٹھی۔ وہ بولی پروفیسر صاحب۔ دریا بننے کیلئے تو بہت ہمت درکار ہے۔ اگر ایک قطرہ کو بھی اپنی حقیقت کا پتہ چل جائے تو پھر بھی بندھ نہیں باندھا جا سکتا

ہردیپ کی نگاہوں کی گہرائی اور بھی اتھاہ ہو گئی۔ "راج ایسا معلوم ہوتا ہے تم بہت آگے نکل آئی ہو۔ وہ بولا۔

راج خاموش رہی......... اور ہردیپ کنویس کی طرف دیکھنے لگا۔ قوسِ قزح کا رنگ پھیلتا اور مسکراتا سا نظر آنے لگا۔ اس نے تیزی سے اپنی نگاہیں کنویس پر سے ہٹا لیں۔ اور کونے میں ایک طرف رکھے ہوئے گلدان کی طرف دیکھنے لگا۔.........

راج بول اُٹھی۔ "تو پروفیسر صاحب آپ نے بتایا نہیں کہ دل کا آئینہ کیسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ ہردیپ گڑگڑا کر بولا...... راج میں بہت غریب ہوں....... میرے ماں باپ بُوڑھے ہیں۔ میرے سوا اُن کا

کوئی سہارا نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ راج! میں غریب ہوں۔

راج یہ سُن کر اچنبھے میں رہ گئی۔۔۔۔۔۔ وہ بولی "مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے"

ہردیپ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا "تم نے بہت کچھ کہہ دیا ہے راج اب کہنے کو باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ قطرہ دریا تو کیا سمندر سے بھی پرے جانے کی ٹھان چکا ہے"۔

کہتے کہتے سیٹھ جی کا گلہ خشک ہو گیا وہ لبوں پر زبان پھیر کر کھنکارتے ہوئے بولے۔۔۔۔۔۔۔۔ اُس کے بعد یاد ہے کہ آرٹ نمائش میں حصہ لینے کے لئے راج ہردیپ کے ہمراہ بمبئی گئی تھی۔ میں نے رام آدھار کو بھی ساتھ روانہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہاں بمبئی میں ایک شام جب لوگ انڈیا گیٹ کے پاس چہل قدمی کر رہے تھے اور دن بھر کا تھکا ہارا سورج سمندر میں غسل کرنے کی تیاری میں مصروف تھا۔ ہردیپ اور راج نے سمندر کی سیر کے لئے کشتی کرایہ پر لی۔۔۔۔۔۔ رام آدھار بھی ساتھ ہی تھا۔ ہلکی پھلکی کشتی لہروں پر ہچکولے لے رہی تھی۔ اور ہردیپ اور راج جذبات کی موجوں میں تھر تھرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ رام آدھار نے بتایا تھا۔

ہردیپ نے راج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا ڈر رہی ہو؟"

راج مسکرائی۔ بولی "جب کشتی لہروں کے حوالہ کر دی تو ڈر کس بات کا۔"

ہردیپ نے ملاح کے قومی بازوؤں پر چپوؤں کی حرکت کے ساتھ ساتھ سطح پر مچھلیوں کو ناچتے دیکھ کر کہا "ناخدا ہوشیار معلوم ہوتا ہے"

راج جذبات کی رَو میں بہہ رہی تھی وہ بولی "ناخدا یا خدا کسی کی مہربانی سے پار ہو ہی جائیں گے۔ مگر ہاں ناخدا بے چارا کیا کرے اگر ہم ہی ڈر میں ڈوب جائیں سمندر میں ڈوبنے کی بجائے۔

ہردیپ بولا۔" کتنی ہمت بندھا دیتی ہو تم راج"

راج نے کوئی جواب نہ دیا.......................

وقت گذرتا چلا گیا....... پھر....... ایک دن سوامی آتما نندجی ہمارے ہاں پدھارے......... انہوں نے راج کی شادی سیٹھ گردھاری لال کے لڑکے سے کر دینے کی تجویز کی...... ہم نے سوچا...... اور چاہیئے بھی کیا گردھاری لال کا لڑکا اکلوتا لڑکا ہے ہر شہر میں اُن کا بیوپار ہے...... کروڑوں کا لین دین ہے....بھلا ایسے گھر سے اچھا گھر راج کے لئے اور کون سا ہو سکتا ہے...... کوشش کرنے پر سوامی جی کی جدوجہد سے گردھاری لال نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ شادی کا مہورت طے پایا...... رام آدھار نے مجھے بعد میں سب بتایا۔"

ہردیپ اُداس تھا...... ریگستان میں کسی خشک پودے پر پڑی ہوئی شبنم کی طرح اُداس......... اور راج بھی اُداس تھی......... مگر اس اُداسی میں جرأت اور جرأت کے ساتھ سب کچھ کر گذرنے کے جذبات کی جلا تھی.......... ہردیپ نے اپنی بنائی ہوئی شکنتلا کی مغموم تصویر دیکھتے ہوئے کہا تھا" جس کا ڈر تھا وہ طوفان اُٹھنے لگا ہے"

راج قدرے مسکرا کر بولی" پروفیسر صاحب آپ نے سکھایا

ہے اور میں نے سیکھا ہے۔ کنولیس پر پہلے رنگ بکھیرتے ہیں....
رنگ مچل کر پھیل جاتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھ کر اس پھیلاؤ سے
نفرت کرنے لگیں........اور پھر اُنہی رنگوں کے پھیلے ہوئے
طوفان سے مصور کا ہلکا ہلکا برش مسکراتے ہوئے دھندلکے.......
قہقہے لگاتی ہوئی اُفق........ جھومتے ہوئے بادل اور لہلہاتے ہوئے
پھولوں کے خاکے اُبھار لیتا ہے۔
ہردیپ نے پوچھا "تمہارے دل میں اب بھی کوئی اُمید ہے"
راج نے گویا دُنیا بھر پہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا "اُمید ہے وہ
.......جو ناخدا کی محتاج ہو....... مجھے معلوم ہے کہ یہ کشتی میں نے
تنہا پار لگانی ہے.......اور میں اِسے پار لگاؤں گی۔
اور اس کے بعد معلوم ہے........ اس رات کو راج رن
چنڈی کی مورتی بنی ہمارے سامنے آکھڑی تھی۔ کتنی دلیری.......
کتنا جوش........ اور کتنی جرات تھی اس کے لہجے میں جب اُس
نے کہا تھا "پتاجی! مجھے شادی کا یہ رشتہ منظور نہیں ہے"
میں کڑکا تھا "چُپ رہو" اور تم.....تم ہکّی بکّی رہ گئی تھیں
راج کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد بولی تھی....... پتاجی میں
وہاں شادی نہ کروں گی۔
میں نے جواب دیا تھا "میں سوامی آتما نند کی مرضی کے خلاف
نہیں چل سکتا" اُن کی یہی صلاح ہے" راج نے کہا تھا سوامی
جی کو اس دُنیا کی خبر ہی نہیں ہے جس کی صلاح وہ دے رہے ہیں۔
پھر تم نے زندگی میں پہلی بار راج کے منہ پر طمانچہ مارا تھا اور

وہ خاموش اپنے کمرے میں واپس چلی گئی تھی ...... ہم نے راج کا کالج جانا بند کر دیا تھا ...... مصوّری سیکھنا بھی بند کر دیا تھا اور ہردیپ کو جواب دے دیا تھا .... راج بیمار ہو گئی تھی۔ ...... اور تم رام آدھار کو ہمراہ لے کر راج کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کشمیر لے گئی تھیں۔ تم سیدھی سادھی ...... گھر کے اندر بیٹھنے کی عادی۔ تمہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ ہردیپ بھی کشمیر پہنچ گیا ہے .... رام آدھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ڈل کی نیل گوں جھیل کے بیچوں بیچ چار چناروں کے سائے میں .... آسمان پر مسکراتے ہوئے چاند کو اور جھیل کی تہ میں قہقہہ لگاتے ہوئے تاروں کو گواہ بنا کر .... راج نے ہردیپ کے قدموں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پروفیسر صاحب! آج سے میں تم کو ناتھ کہوں گی" اور تم جانتے ہو ہندو لڑکی دُنیا میں صرف ایک ہی کو ناتھ کہتی ہے"......

ہردیپ نے دور پہاڑ کی چوٹیوں پر جو برف آلود تھیں ...... چاند کی کرنوں کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا .... اپنی قسمت پر یقین نہیں آتا ہے راج ....

راج نے جواب دیا تھا " آپ یہ بھی تو کہا کرتے ہیں کہ تصویر بن جانے کے بعد آپ کو یقین نہیں آتا کہ یہ تصویر آپ کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔

اور ہردیپ راج کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا تھا ...... نہ جانے کتنے پریمیوں کے سپنے اِن چار چناروں کے جھینے جھینے سایوں تلے جوان ہوئے ہوں گے ...... نہ جانے کتنے وعدے کتنے عہد .... کتنے قول و قرار مستی اور خوشبوؤں کی اس دُنیا

میں پرورش پا گئے ہوں گے۔ کچھ کے خواب پورے ہو گئے ہوں گے اور کچھ کے ٹوٹ گئے ہوں گے ...."

راج نے جواب دیا تھا "مگر وہ خواب ٹوٹ کر بھی مرے نہیں .... دیکھو ڈل کی تہ میں ستارے بن کر مسکرا رہے ہیں۔

چنار جھوم رہے تھے جب ہردیپ نے راج کے لمبے لمبے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے کہا....... کاش مجھے ستار آتی ہوتی...... اس وقت میں وہ نغمے گدگداتا کہ ستارے جھیل کی تہ میں سے نکل کر تمہارے قدموں پر موتی لٹا دیتے.. ...... رات کی رانی اور گل داؤدی اپنی جھولیاں اُلٹ دیتیں ...... سری نگر کی حسین وادی گویا موسیقی میں لوٹ پوٹ ہو کر بڑھ کر تمہارے ہاتھوں کو چوم لیتی .... اور یہ چار چنار ایک ہو جاتے۔

راج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ذرا بلندی سے کھڑے ہو کر دیکھئے ...... یہ چار چنار ایک ہی نظر آئیں گے۔

اور پھر راج کشمیر سے صحتیاب ہو کر لوٹی ہمیں کتنا تعجب ہوا جب راج نے آتے ہی کہا تھا "کہ مجھے گردھاری لال کے لڑکے سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے"

کتنے دھوم دھام سے آئی تھی راج کی برات ....

چار چار بینڈ باجے تھے...... سینکڑوں موٹریں ہوں گی..... شہر کا کون سا رئیس تھا جو برات میں شامل نہ ہوا تھا.... اور پھر پنڈت جی نے منتر پڑھنے کے بعد جس وقت راج کا ہاتھ بر کے

ہاتھ میں دینے کے لئے مجھے کہا .... راج گھونگھٹ اُٹھا کر
جھٹ پٹ اُٹھ کھڑی ہوئی .... گویا ساکشات درگا آسمانوں
سے اُتری ہو .... کتنی گرج تھی اس کی آواز میں جب اُس نے
کہا تھا یہ ناٹک بند کرو" .... کوئی بھی کچھ نہ بولا ....
اور راج کی آواز گویا گھور گھٹاؤں کو چیر کر گرجنے والے بادل کی طرح
بلند ہوتی جا رہی تھی .... "شادی زبردستی کا بندھن نہیں
ہے .... یہ دو روحوں کا ناطہ ہے .... تشدد اور
زبردستی کے بعد اس رشتہ کو ویدوں کے منتر بھی زندہ نہیں رکھ
سکتے ہیں .... میں اپنا فیصلہ کر چکی ہوں"
اور اس کے بعد وہ لوگ جو میری تعریفوں کے پُل باندھتے
میرے گھر پر آئے تھے مجھے گالیاں دیتے .... کوستے اور
باتیں بناتے .... واپس لوٹ گئے .... سوامی آتما
نند کی نگاہوں سے اس وقت روحانیت کے نور کی جگہ خون
برس رہا تھا ....
اس واقعہ کے تین دن بعد راج نہ جانے کہاں گم ہو گئی..
...... شہر کا چپہ چپہ اس قصبہ کا کونا کونا۔ ہندوستان کا ذرہ
ذرہ چھان مارا۔ مگر کہیں بھی تو اس کا اور ہردیپ کا پتہ نہیں
چلا۔ آج دو برس ہونے کو آئے معلوم نہیں وہ دونوں گمنامی
کی کون سی دُنیا میں چلے گئے ہیں۔ کاش راج مجھے مل جاتی ......
وہ آج دیکھتی کہ اس کے تیاگ نے اس کے پتا میں آج کتنی تبدیلی
پیدا کر دی ہے .... یہ کہتے کہتے سیٹھ جی آنے والے نوکر

پر برس پڑے وہ چلّائے " نالائق کہیں کا ...... سو دفعہ کہا ہے کہ جس وقت ہم دونوں اکیلے بیٹھے ہوں ہمیں قطعی پریشان نہ کیا کرے" نوکر نے ڈرتے ڈرتے کہا " میں سمجھا حضور باہر گنگا کے کنارے سیر کرنے گئے ہوئے ہیں اس لئے ادھر نکل آیا .... اور پھر وہ ساوتری سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا " سیٹھانی جی وہ بڑھیا گاندھی جی کی تصویر لے آئی ہے ...... اور بیچنے پر تیار ہو گئی ہے۔

ساوتری یہ سن کر خوش ہو کر بولی " لے آؤ اسے یہاں ......

کچھ ہی دیر بعد نوکر بڑھیا کو ساتھ لے کر آ پہنچا ...... بڑھیا نے تصویر زمین پر رکھتے ہوئے کہا .... خرید لیجئے سیٹھانی جی یہ تصویر .... جس کی نشانی سمجھ کر میں اس تصویر کو جدا نہ کرنا چاہتی تھی میرا وہ بیٹا واپس آ گیا ہے .... اب میں تصویر بیچ سکتی ہوں۔

سیٹھ جی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے "کون ہر دیپ" ؟

بڑھیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

سیٹھ جی نے بڑی تیزی سے پوچھا "کہاں ہے وہ ؟

بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا " باہر کھڑا ہے حضور "

سیٹھ جی بچوں کی طرح باہر کو دوڑ پڑے .... بڑھاپے کے باوجود ان میں ایک نامعلوم سی شکتی آ گئی تھی .... کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹے .... ان کا گلا روندھا ہوا تھا ....

وہ ساوتری کے پاس آتے ہوئے بولے .... یہ دیکھو ساوتری تمہارا داماد .... اور یہ تمہاری راج۔ ساوتری راج

کے گلے سے لپٹ گئی۔

سیٹھ جی مہاتما جی کی تصویر پر نظر جمائے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے " بیٹا راج میری وہ آنکھیں جنہیں سوامی آتمانند کی بھگتی نہیں کھول سکی تھی تمہارے تیاگ نے کھول دی ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے...... آج سے میری دولت میری جائیداد میرا اپنا سرمایہ نہیں ہے۔ یہ بھارت کے تیس کروڑ بھوکے ننگے مزدور منددوں کی امانت ہے اور میں محض اس امانت کا امانت دار ہوں.......... میں صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اس بڑی دولت میں سے تنخواہ کے طور پر کچھ حصہ لوں گا۔ اس دولت پر ناجائز قبضہ ہی کا نتیجہ تھا کہ جس کی وجہ سے نہ صرف میں اپنی بیٹی کی امنگوں کے خون سے ہولی کھیلتا رہا...... بلکہ بھارت کے کروڑوں بیٹے اور بیٹیوں کے جذبات کو اپنی ہوس اور لالچ کی بھٹی میں پھونکتا رہا راج تم میری بیٹی نہیں میری گورو ہو۔ تم آتمانند سے کہیں زیادہ پوتر اور شدھ ہو۔

مہاتما گاندھی کی تصویر کے گرد چاند کی کرنوں نے ہالا بنا لیا تھا اور غریبوں کی دولت کے امانت دار سیٹھ کشن لال کی آنکھوں سے دو آنسوؤں کے قطرے بہہ کر تصویر کے قدموں پر گر پڑے۔

افسانہ نگار

کوئی مانے یا نہ مانے .... دلیپ افسانہ نگار ضرور تھا۔ یہ ایک اور بات ہے کہ زمانہ نے اُسے منشی پریم چند یا سرت چند چٹو پادھیائے .... یا بنکم بابو کی طرح شہرت کی سند عطا نہ فرمائی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر کسی گویئے کو ریڈیو والوں نے پروگرام دینے سے انکار کر دیا ہو تو کیا وہ گویا نہیں۔ یا اگر کسی حجام کو کسی بڑے لیڈر کی حجامت بنانے کا موقعہ نہ ملا ہو تو کیا وہ حجام نہیں .... تو دلیپ افسانہ نگار تھا۔ حالانکہ اُس کی اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ اس کا باپ بھی افسانہ نگار تھا۔ ....

اس کی اور وجوہات تھیں۔ اوّل تو یہ کہ اس کی شکل افسانہ نگار کے بیٹوں جیسی نہ تھی۔ کیونکہ اور چاہے کچھ بھی ہو افسانہ نگاروں کی اولاد کی شکل پر بدھو پن نہیں ٹپکتا ہے۔ اور وہ تو شکل و صورت سے بالکل بُدھو معلوم ہوتا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اپنے باپ کا ذکر کرتے وقت کچھ اس طرح جھنیپ جاتا تھا۔ گویا اسکے لاشعور میں کہیں اپنی ولادت کے بارے میں ایک ہلکا سا شک رینگنے لگتا ہے۔ جبکہ افسانہ نگاروں کے بچوں کو اُن کے باپ کا علم شاید پیدا ہونے سے پیشتر ہی ہو جاتا ہے"

افسانہ نگاروں والی کون سی بات تھی جو اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ بڑے سے بڑے آدمی پر پھبتی کسنے سے نہیں چوکتا. ...... بھائی۔ بہن۔ بیوی اور بچہ وہ سب کے لئے ایک معمہ

بننے کی کوشش کرتا رہتا۔ رات کے دو بجے اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور لالٹین جلانے کے بعد لکھتا لکھتا ہی سو جاتا۔ کیا لکھتا اس وقت وہ یہ تو بعض دفعہ شاید اس کو خود بھی نہیں معلوم ہو گا۔ مگر وہ کچھ لکھتا ضرور اور جب اس کی بیوی کراہتی ہوئی بڑبڑاتی کہ روشنی میں نیند نہیں آ رہی ہے۔ تو وہ قلم اپنی رضائی پر رکھ کر اپنی بیوی کی طرف گھور کر دیکھتا اور پھر بڑبڑاتا خدا معلوم خدا نے افسانہ نگار کی بیوی بناتے وقت اتنے اناڑی پن کا ثبوت کیوں دیا ہے۔ نہ جانے اسے کیا سوجھتی ہے انجن کے دُم چھلے میں بیل گاڑی باندھ کر........

اس کو اپنی افسانہ نگاری پر ناز بھی تھا........ وہ اکثر کوٹلے والے کیدار ناتھ کی دوکان پر حقّہ کا کش لیتا ہُوا کہتا "پنڈت جی بڑی مشکل ہے افسانہ نگاری........ قدرت کی حقیقت اور انسانی فطرت کو لفظوں کا لباس پہنا کر کاغذ پر آراستہ کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے........ بالوں سے پسینہ نکل آتا ہے۔

اور کیدار ناتھ اپنے آپ نوسی دانتوں کو بکھیرتا ہُوا کہتا " بھیّا اس قصبے میں تمہارے گُن کو کوئی نہیں سمجھتا۔ تم کسی بڑے شہر میں چلے جاؤ۔ جنم جنمانتر کے دَلدّر دُور ہو جائیں گے۔۔ اور دلیپ کا تخیّل بمبئی یا کلکتہ کے نقشے تراشنے لگتا۔ دس دس منزلہ عمارتیں۔ ٹرام کاریں قسم قسم کی موٹریں........ رنگ برنگی شکلیں۔ بڑے بڑے ہوٹل طرح طرح کے سینما گھر اور میلوں تک پھیلا ہُوا سمندر........

کیدار ناتھ اس کے ہاتھ سے حُقّہ اپنی طرف کھینچتا ہُوا پوچھتا "کیا کوئی نئی کہانی سوچنے لگے" دلیپ کے خیالات کا بہاؤ رُک جاتا۔

وہ بول اُٹھتا - "یوں ہی ایک لہراتا سا خیال دماغ میں آگیا تھا"
کیدار ناتھ بول اُٹھتا "سناؤ تو"۔
دلیپ ہنستا ہوا کہتا "پنڈت جی آخر آپ پنڈت جی ہیں۔ ابھی تو خیال کا بیج پڑا ہے۔ کہانی کا پودا تو دو چار دن میں جا کر کہیں پھوٹے گا ...... اور دلیپ ایسی باتیں کرنے کے بعد راگھو دہی بڑے والے کی دوکان کی طرف چل دیتا۔ اور کیدار ناتھ اپنے اکلوتے لڑکے بھیکھو کو تلقین کرتا ہوا کہتا "اس جیسا نالائق نہ بننا بیٹا۔ گدھا باپ کی سب جائیداد پھونک کر اب قصہ کہانیاں لکھ رہا ہے۔ دس سال میں بی اے نہیں پاس کر سکا۔ سمجھتا ہے خود کو افلاطون کا بچہ"
بھیکو آستین سے ناک صاف کرنے کے بعد اٹھارہ کا پہاڑا دوہرانے لگتا.........

میں اس سے پہلے پہل اسی کے قصبہ دینا نگر میں ملا تھا۔ میں ایک دوست کی برات میں شریک ہو کر اس قصبہ میں گیا تھا۔ کسی نے دلیپ کو میرے آنے کی اطلاع دے دی۔ وہ رات کو میرے کمرے میں آدھمکا۔ اس وقت اس کا لباس میموں جیسا تھا۔ کتھئی رنگ کا کھدر کا کرتا...... گھٹنوں پر سے قدرے گیا ہوا تنگ مہری کا پاجامہ سر اور پیر برہنہ۔ میں سمجھا کوئی آٹا دال بیچنے والا دوکاندار مجھے سیلز ٹیکس کا انسپکٹر سمجھ کر اپنے حساب کی جانچ پڑتال کرانے آیا ہے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ اس سے پوچھوں دلیپ خود ہی بول اٹھا۔
"میں دلیپ ہوں۔ آپ رشی ہیں نا؟
مجھ کو تعجب سا ہوا۔ مگر میں نے قدرے سنجیدگی برتتے ہوئے

کہا۔ "معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" جواب مِلا "میں آپ کی برادری کا ہوں"

میں نے ایک دفعہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ بیاہ شادیوں میں ذات برادری کی کھوج ڈھونڈنے والے بہت سے مِل جاتے ہیں۔ میں نے بناوٹی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "تو آپ بھی براہمن ہیں"؟

جواب ملا۔ "جی نہیں میں کھتری ہوں"

مجھے اس جواب سے حیرت ہو رہی تھی۔ کہ اتنے میں دلیپ خود ہی بول پڑا "ذات برادری سے میرا مطلب ہے کہ میں بھی افسانہ نگار ہوں"

میں نے اخلاقاً کہا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر"

دلیپ نگاہوں سے زمین ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "مگر مجھے آپ سے مل کر قطعی خوشی نہیں ہوئی ہے" دلیپ کے اس جواب نے مجھے قدرے حیرت میں ڈال دیا۔ اور میری خودداری جھنجھلا اٹھی۔ میں نے قدرے ترشی سے کہا "تو آپ مجھ سے مِلنے کیوں آئے ہیں۔ میں نے آپ کو کوئی دعوت نامہ تو بھیجا نہیں تھا"

نہایت سیدھا سادہ جواب مِلا۔ "آپ افسانہ نگار جو ہیں"

مجھے اور بھی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میرے لاشعور پر میرے ایک پرانے واقف سرور کی دھندلی سی شکل اُبھرنے لگی ....

تین سال کا عرصہ ہوا۔ ایک مشاعرہ نے آپ کا تعارف مجھ سے کرانے کی سخت گستاخی کی تھی .... پھٹا ہوا ململ کا کرتا۔

کھلی جھری کا بوسیدہ سا پائجامہ لمبے لمبے خشک اور اُلجھے ہوئے بال....
........آٹھ دس روز کی بڑھی ہوئی حجامت۔آپ نے مجھے باتوں ہی
باتوں میں بتایا تھا کہ آپ ہندوستان میں ترقی پسندی کے موجودوں میں
سے ہیں۔آپ اپنا کلام رسائل میں اس لئے نہیں بھیجتے کہ ہندوستان
میں کوئی ترقی پسند رسالہ ہی نہیں۔سب رجعت پسند اداروں کے
دلال ہیں اور صحیح ترقی پسندی سے قطعی ناواقف...... پھر آپ
میری طرف گھورتے ہوئے بولے تھے...... بھئی افسانہ نگاری
سوائے بکواس کے کچھ نہیں ہے........اگر تم اپنی صلاحیتوں کو
اجاگر کر کے ادب میں اپنے لئے جگہ بنانی چاہتے ہو تو شاعری کیا کرو"
........اور میں اِن حضرت سرور کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔اُس
مشاعرہ کے بعد آپ مجھے میرے گاؤں میں ملے۔نہ جانے کس مسخرے
نے انہیں میرا پتہ بتا دیا تھا...... آپ نے مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی
اپنے کرتے کا گریباں پھاڑ ڈالا........اور پھر یکلخت میرے گلے
سے لپٹ کر رونے لگے۔میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "سرور صاحب
کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی........یہ آپ رونے کیوں
لگے۔کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے۔یہ آپ نے اپنا گریباں کیوں
پھاڑ ڈالا۔آپ لگے فرمانے "بھئی میں شاعر ہوں" میں جذبات کا
شہنشاہ ہوں.....رشی بھائی میں قدرت کا ترجمان ہوں۔میں فطرت
کا ہمنوا ہوں۔تمہیں دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ اپنے آپ کو
قابو میں نہ رکھ سکا...... یہ گریباں اور یہ آنسو اپنے عزیز دوست
کی خدمت میں ایک غریب شاعر کی نذر ہیں۔سرور صاحب کے

خلوص نے مجھے متاثر کر دیا۔

شام ہوئی اور آپ بولے "حلق سُوکھ رہا ہے"۔

گاؤں کا ماحول اور رجعت پسندوں کا خاندان...... ہزار جتن کر کے سرور صاحب کے حلق کو تر کرنے کا بندوبست بھی میں نے کسی نہ کسی طرح کر ہی دیا۔ وِسکی نہیں تو ٹھرّا ہی سہی۔ آخر ایک ترقی پسند شاعر کی تمناؤں کو تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.... اگلے دن جب آپ مجھ سے بچھڑے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ معلوم ہوتا تھا...... آپ کی خودداری لچک کھا رہی ہے اور آپ کچھ کہتے کہتے رُک جاتے ہیں۔ میں نے کہا "کیا بات ہے آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر نہ جانے کیا سوچ کر کچھ کہہ نہیں رہے ہیں۔

سرور صاحب دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے "کچھ روپوں کی ضرورت ہے کرتے سلوانے ہیں۔

میں نے پوچھا تو آپ نے کل کرتا کیوں پھاڑ دیا تھا؟

سرور صاحب نے عجب سادہ لوحی سے جواب دیا" وہ تو پھٹ ہی چکا تھا اور پھر یکلخت وہ سنبھلے اور بولے وہ ایسا پھٹا بھی نہیں وہ تو آپ سے ملنے کی خوشی میں تار تار ہو گیا تھا۔

میں سب کچھ سمجھ گیا.... یہ ایک آرٹسٹ کی موت تھی۔ یہ ایک فن کار کا زوال تھا۔ انسانیت کی شکست تھی........ ایک ترقی پسند کی ترقی پسندی کا جنازہ تھا...... کرتا سلوانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ؟...... ایک پرولتاری شاعر کی جدّتِ فریب نے خلوص اور محبت کے نام پر کیٹوں کی ناک فدا سے اشارے میں کاٹ

ڈالی تھی۔ شاعر نے اپنی خودداری کا لاشہ اپنے دامن سے نکال کر میرے سامنے رکھا۔ اور میرے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا...... بلکہ میری جیب تراشنی چاہی تھی۔ یہ میری طاقت سے باہر تھا کہ میں اُس کو کرتہ کے لئے یا اس کی خودداری کے کفن کے لئے بیس روپیہ نہ دیتا........ اور سرور کی خودداری کے لاشے کو حرص و ہوس کے کتّے میری آنکھوں کے سامنے اُس وقت نوچ رہے تھے کہ جب مجھے ایک میرے گاؤں والے نے بتایا کہ سرور نے گاؤں کی حدود کے باہر ٹھیکہ پر سے بیس روپیے کی دیسی شراب خریدی ہے........

میری نگاہوں کے سامنے بنگال کے اُن ننھے ننھے بچوں کی لاشیں گھوم گئیں جن میں سے کتنے ہی دو دن اور جی لیتے اگر انہیں بیس پیسوں کے چاول ہی مل جاتے ...... اور پھر سرور کی اُس نظم کے دل ہلا دینے والے مصرعے میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ جو اُس نے بنگال کے قحط پر لکھی تھی۔ جس میں اس کی قلم نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاعری میں زور محض جذبات ہی نہیں بناوٹ بھی بھر سکتی ہے۔ تخیل کی چابکدستی شرط ہے۔

تو خیر میں سمجھا دلیپ بھی سرور ہی کا کوئی ساتھی ہے۔

دلیپ نے غالباً میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے جذبات کی گونگی زبان کو سمجھ لیا تھا وہ بولا "آپ کو شاید میری بات سے کوئی ذہنی کوفت ہوئی ہے مگر مجھے اِس کا افسوس نہیں..... کیونکہ میں نے وہی کہا ہے جو میں نے محسوس کیا ہے"...... مجھے دلیپ کی یہ بات اور بھی زیادہ ناگوار محسوس ہوئی۔ مگر فوراً ہی بعد میں نے سوچا کہ

اِسے سرور کی طرح بخشنا غلطی ہوگی۔ اِسے اس کی شکل اسی کے آئینے میں دکھائی جائے تو بہتر ہے.............

میں نے پوچھا "کہیئے آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ یہ سوال میں نے اس لئے پوچھا کہ دلیپ مجھ سے اپنی ضروریات بیان کرے گا.....
اور پھر

دلیپ نے قطعی بے نیازی سے کہا "آپ کے سامنے اپنی ضروریات رکھ کر میں اپنی خودداری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف آپ سے افسانہ نگار کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں"....

میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "لیجئے مجھے افسانہ نگاری کی حیثیت سے مل لیجئے"۔ دلیپ کسی سوچ میں پڑ گیا اور پھر رُکتے رُکتے بولا "آپ کے افسانوں میں آپ کا ذاتی تجربہ کس حد تک ہوتا ہے"۔

میں کچھ ہچکچایا اور میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "جتنا ضروری ہو"۔ دلیپ نے کہا۔ "آپ کے کردار روحانی بہت ہوتے ہیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے"۔

میں نے جواب دیا۔ "آپ تو اخباری نامہ نگاروں کی طرح پوچھ گچھ کر رہے ہیں"۔

دلیپ نے جیب سے ایک نوٹ بک سی نکالتے ہوئے کہا "میرا ایک افسانہ سُنیے گا۔ میں اس وقت کسی بھی افسانہ سُننے کے موڈ میں نہ تھا........ میں نے دلیپ کا دل رکھتے ہوئے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوگی آپ کا افسانہ سن کر........ مگر........

دلیپ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مگر وگر کچھ نہیں۔ میرا افسانہ سنانے کا موڈ آیا ہوا ہے اور آپ کو میرا افسانہ اسی وقت

سننا ہوگا۔

میں جی ہی جی میں جھنجھلا اُٹھا۔ آخر اس شخص نے اپنے موڈ کا تختۂ مشق مجھے ہی بنانے کی کیوں ٹھانی ہے۔ میں نے قدرے خفت سے کہا "جی نہیں"

دلیپ جھلا اُٹھا "آپ فن کار نہیں ہیں۔"

میں نے جواب دیا "بہت اچھا شکریہ"

دلیپ اُٹھتا ہوا بولا....... آپ کا سلوک ایک فن کار سے نہایت لچڑ ہے۔ مگر آپ کے چہرہ پر کافی معصومیت ہے۔ میں آپ سے کبھی نہ کبھی ملوں گا ضرور...........

دلیپ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا گیا.......

میں دلیپ کو بھول چکا تھا..... کہ اچانک ایک دن وہ مجھے بمبئی میں شیواجی پارک میں ملا...۔ میں تو اُسے پہچان نہ سکا مگر اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ عجیب حلیہ تھا اس وقت دلیپ کا۔ ٹخنوں سے اونچی پتلون...... پرانا سا بند گلے کا پارسی کوٹ........ کندھوں تک جھولتے ہوئے بال....... بڑھی ہوئی داڑھی اور گھنی مونچھیں آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ...... ہاتھ میں ایک کنویس کا تھیلہ...... جس کے شکم سے مٹیالے رنگ کے کاغذ باہر جھانک رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دلیپ بولا "رشی تم تو مجھے بھول ہی گئے........ چلو کافی پیئں" چلو بھئی.......!

دلیپ میں اب پہلے والا اکھڑپن نہیں تھا..... اس کے چہرے پر ٹیگوریت کا جلال تھا...... اور اس کی زبان میں مٹھاس

...... میں دلیپ کے ساتھ کافی ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں میں نے اس کی شکل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا" یہ حلیہ کیا بنائی ہے
دلیپ کچھ جھینپتا ہوا سا بولا" ایک فن کار کو شکل سے بھی فن کار معلوم ہونا چاہیئے...... تمہاری طرح تھوڑی......... حلیہ سے بیوپاری معلوم ہوتے ہو......... اور میں نے تو اپنا نام بھی بدل لیا ہے..."

میں نے پوچھا" کیا نام رکھا ہے اب تم نے اپنا"

دلیپ کافی ہاؤس کے دروازے میں داخل ہوتا ہوا بولا" "پریتم بھارتی"

ہم دونوں ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھے...... کچھ ہی دور دوسرے میز پر وہ شائد کوئی کالج کی لڑکی تھی...... نہایت حسین لڑکی مگر نگاہوں میں دنیا بھر کی ناامیدیوں کو سمیٹے ہوئے۔ کافی کے پیالے پر نگاہیں جمائے...... اپنے خیالات میں نہ جانے کہاں بہی چلی جارہی تھی۔ میں نے بھی اسے دیکھا اور دلیپ کی نگاہیں بھی بار بار اس کی طرف اٹھنے لگیں......... اور پھر دلیپ بڑبڑایا" کتنی حسین لڑکی ہے"

میں کچھ نہ بولا۔ میں دلیپ کے تاثرات کو دیکھنا چاہتا تھا۔

دلیپ پھر بولا۔" یہ لڑکی کتنی بدقسمت ہوگی"

میں تعجب انگیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔" تمہیں کیسے معلوم"

دلیپ کافی کی چسکی لیتا ہوا بولا" ہندوستان کے کسی بھی

فرقہ میں کسی سماج میں کوئی گہرائی نہیں ہے ...... جتنی ایک لڑکی حسین ہوگی اس کی طرف حرص وہوس کی نگاہیں پھینکنے والے اتنے ہی زیادہ ہوں گے .... اس لڑکی کو چاہنے والے بھی کتنے ہی ہوں گے ...... اور پھر یہ کسی ایک ایسے چاہنے والے کو خود چاہنے لگ پڑی ہوگی .... اور پھر ذات کا سوال ...... روپے کا سوال .... یا ایسا ہی کوئی اور سوال اس کے رومان کی دھجیاں اڑا دینے کے لئے کھڑا ہو گیا ہوگا .... اور اب یہ اوداس ہے۔ شمشان میں اُگے ہوئے کسی ببول کے درخت پر بیٹھی ہوئی کوئل کی طرح اوداس .... میں دل ہی دل میں دلیپ کے مشاہدے کی داد دے رہا تھا۔

دلیپ کی پلکیں بھنچ گئیں مگر اس کی نگاہوں کے پیچھے نیلی سی گہرائی اور بھی اتھاہ ہو گئی۔ اس کی آواز مدھم تھی مگر اس آواز کی گونج دل کے گنبد کی آغوش سے بلند ہو رہی تھی۔ شدت جذبات سے اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے .... وہ کہہ رہا تھا یہ رشی ۔ ہندستان میں حسن خدا کی دین نہیں شیطان کی لعنت ہے۔ اس کے محل کے دروازے پر باپ۔ بھائی ... بہن .... خاوند ... جیٹھ ...... پڑوسی اور خواہ مخواہ کے خیر خواہ سانپ کی طرح ایسی کنڈلی مار کر بیٹھے ہیں کہ آس پاس سے نکلنے والوں کو بھی اپنی زہریلی پھنکاروں سے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

میں اس دوشیزہ کی طرف دیکھنے لگا جس نے دلیپ کے جذبات کی آگ کو اتنا بھڑکا دیا تھا اور پھر اس خیال سے کہ دیکھنے والے میری

نگاہ تجسس کو گستاخ نظریں نہ سمجھ بیٹھیں میں دلیپ کی طرف دیکھنے لگا۔
دلیپ بولا "میں اس لڑکی سے قطعی ناواقف ہوں"۔
میں نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مگر دلیپ یہ باتیں ایک ایسے دل سے نکل رہی ہیں جو معلوم ہوتا ہے وقت کے ہاتھوں سخت چوٹ کھا چکا ہے۔
دلیپ اپنے دونوں ہاتھوں کو سختی سے دباتا ہوا بولا۔ "چوٹ؟ میرا دل چوٹ کھا چکا ہے .... اور ہندوستان میں ہر غریب آدمی کا دل چوٹ کھاتا ہے۔ غریب کا دل بھی تو دل ہی ہوتا ہے ..... اور اس دل میں دھڑکنیں بھی ہوتی ہیں.......... اُن دھڑکنوں کی آغوش میں جذبات بھی پلتے ہیں ..... مگر وہ جذبات ہوتے ہیں۔ ایک غریب انسان کے جذبات ...... اُس بدقسمت کے جذبات کہ جس کے پاس نیلم اور پکھراج کی جگہ لاچارگی اور افلاس کے آنسو ہوتے ہیں .... جس کے پاس سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ گھٹ گھٹ کر مر جانے والی آہیں ہوتی ہیں۔ اور آنسو اور آہیں تو رشی! جذبات کو عمل کا جامہ نہیں پہنا سکتے۔ غریب سُندر سپنے رچ سکتا ہے مگر سونے چاندی کے سکوں کے بغیر اُن سپنوں کو دھرتی کے سینے پر تو نہیں جمایا جا سکتا"۔
میں نے پوچھا "کیا کسی رئیس زادی سے عشق ہو گیا ہے۔"
دلیپ جھنجھلا اٹھا اور بولا "تمہاری دنیا میں تو سوائے عشق کے کچھ ہے ہی نہیں۔ کیا بغیر عشق کے دل نہیں ٹوٹ سکتا .....
میری بہن جوان ہے اور ماں اندھی ہے میرے پاس اتنا پیسہ نہیں

کر بہن کی شادی کر سکوں۔ مجھے یہاں جے پال نے بُلایا تھا۔۔۔ سینما
کی کہانیاں لکھنے کے لئے۔ میری پانچ کہانیاں سیٹھوں نے یہ کہہ کر رکھ
لیں کہ ان پر غور کیا جائے گا۔۔۔۔۔۔ کچھ دنوں بعد وہ پانچوں کہانیاں
مجھے لوٹا دی گئیں۔۔۔۔۔۔ اور یہ ساتھ لائیں ایک نامرادی کا پیغام۔۔
پچھلے تین مہینے میں ان پانچ کہانیوں میں سے دو اسکرین پر آ چکیں۔۔۔
۔۔۔ سیٹھوں کے منیموں کے نام پر۔۔۔۔۔۔ اور میں میری اندھی
ماں۔۔۔۔۔۔ میری بہن کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ میرے پاس
روپیہ نہیں ہے میرا فن میری جیب نہیں بھر سکتا۔۔۔۔۔۔ وہ دوسروں
کو نام اور دولت دے سکتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ میں غریب ہوں۔۔۔۔
اور اب تو ہندوستانی فن کار کا فن بھی کہنے لگا ہے کہ "میں لاکھ جونیر دن
کی آغوش میں پلا ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے لاکھ بھوک نے جنم دیا سہی۔۔۔۔ کیا
ہوا جو پیاس نے میرے ہونٹ چوم چوم کر میرے جسم میں روح کی
حرارت پھونک دی ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے اپنے ماضی سے کیا لینا۔ میں
تو محلوں میں رہوں گا۔۔۔۔۔۔ محل والوں کو شہرت اور دولت دوں گا
۔۔۔۔ تم غریب ہو نکل جاؤ میرے ایوانوں سے اور نکال دو اپنے
دماغ سے میرا خیال۔۔۔۔۔۔ جانتے ہو۔۔۔۔۔۔ فن کار کے شاہکاروں
کی غاریں کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔ سمندر کے اُس پار۔۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔؟
۔۔۔۔۔۔ کیونکہ قدرت بھی تو یہی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ اگر فن کار کے
شاہکاروں کو دیکھنا ہو اگر فن کی بلندیوں سے اپنی نگاہوں کو ہم آغوش
کرانا ہو۔۔۔۔ تو اے فن کے غریب متلاشی یاس اور نامرادی کے سمندر
میں غرق ہو کر دوسرے کنارے پر اُبھر آ۔۔۔۔۔۔ اس سمندر کو پار کرنے

والے جہاز ..... اسٹیمر ..... اور کشتیاں سب زرداروں کی ہیں....
اِن کے ناخدا زردار ہیں۔ افلاس کا سایہ پڑتے ہی اِن کشتیوں کی
روانی ماند پڑ جائے گی..... اِن کشتیوں کے زرپوش پردے اپنی
چمک کھو دیں گے۔

میرے ذہن میں دلیپ کی باتیں نشتر چبھو رہی تھیں ..... اور
دلیپ کی آواز نے شاید اُس دوشیزہ کے دل کو بھی چھیڑ دیا تھا....
کیونکہ اب وہ کافی کی پیالی کو نہیں دلیپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی....
اور دلیپ نے بھی محسوس کیا..... کہ دوشیزہ اس کی طرف دیکھ رہی
ہے۔ دلیپ یکلخت بول اُٹھا "چلو بھئی چلیں یہاں سے"

مگر وہ دوشیزہ ہماری میز کے قریب آ چکی تھی....... وہ دلیپ
سے مخاطب ہو کر بولی "میں آپ سے اپنا تعارف کرانا چاہتی ہوں....

دلیپ دوشیزہ کی طرف قطعی راغب نہ ہوا وہ مجھ سے بولا "چلتے ہو
یا نہیں"..... ہاں مجھے اپنا پتہ تو بتاؤ کہاں رہتے ہو؟

میں نے کہا "ماٹنگا میں"

دوشیزہ دلیپ کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی.......
اور دلیپ مجھ سے کہہ رہا تھا "میرا مکان اس قابل نہیں ہے کہ تم
وہاں آسکو .... میں تمہیں ضرور ملوں گا"۔

میں نے دلیپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "اِن سے تو بات کرو"

دلیپ کے لب و لہجے میں انتہائی ترشی تھی جب اُس نے جواب
دیا "اِن سے بات تم کرو"۔ تمہیں اپنے افسانوں کے لئے حسن و عشق
کا مواد درکار ہے ..... میرے افسانوں کو تو افلاس سے کراہتی ہوئی

روحوں ہی سے فرصت نہیں ہے .... میں ان سے مل کر کیا کرونگا"
.... یہ کہہ کر دلیپ تیز تیز قدم بڑھاتا کافی ہاؤس سے نکل گیا ......
دوشیزہ میری طرف مڑ کر بولی "کون تھے یہ"
میں نے جواب دیا "افسانہ نگار"
اور دوشیزہ بھی چلی گئی
چار پانچ مہینے بیت گئے .... دلیپ مجھے نہ مِلا ......
نہ جانے بمبئی میں اِنسانوں کے اس وسیع سمندر کی لہروں میں وہ کہاں گم ہوگیا تھا .... ایک دن میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ نوکر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "صاحب! آپ سے کوئی ملنا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا "اس وقت؟ کل مِلوں گا"
نوکر نے ڈرتے ہوئے کہا "وہ آپ کے کوئی دوست ہیں شاید آپ سے اسی وقت مِلنے کی ضد کر رہے ہیں۔ دلیپ نام ہے اُن کا"
میں نے نائیٹ گاؤن پہنتے ہوئے کہا۔ "بلاؤ اُنہیں"۔
دلیپ صاحب کمرے میں داخل ہوئے ...... بال کٹے ہوئے تھے .... داڑھی مونچھیں صاف تھیں .... بڑا قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے .... نیا سیاہ بوٹ بجلی کی روشنی میں دمک رہا تھا ......
دلیپ کمرے میں داخل ہوتے ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ...
"ایک بات سُنو" میں کرسی پر بیٹھ گیا .... ہمہ تن آغوش ......
دلیپ نے کہنا شروع کیا "ایک غار ہے .... اندھیری غار

......ایک کمزور سی ناتواں لڑکی اکیلی اس غار میں داخل ہوتی ہے..
.....آگے بڑھتی ہے.......اور آگے.....اور آگے.....قدم
قدم پر اندھیرا بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اور نہیں بڑھ سکتا
اُس لڑکی کے کانوں میں ہلکی چیخیں آتی ہیں۔ لڑکی کا دل دہلنے لگتا ہے
.... وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی ہے........ اب چیخوں کی
بجائے یک لخت ہزاروں اور لاکھوں قہقہوں کی آوازیں اُبھر آتی ہیں
غار کا ذرّہ ذرّہ کانپنے لگتا ہے......... لڑکی زمین پر گر کر بے
ہوش ہو جاتی ہے....... ہلکی ہلکی سرد ہوا اِسے ہوش میں لاتی ہے
وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے....... پھر آگے بڑھتی ہے....... دُور
بہت دُور اُسے ایک چنگاری سی نظر آتی ہے۔ اُمید اس کی نگاہوں میں
روشنی بن کر بِکھرنے لگتی ہے۔ اُسی وقت پھر اُن مہیب۔ ڈراونے اور
بھیانک قہقہوں کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اُمید کی روشنی اس کی آنکھوں سے
غائب ہو جاتی ہے....... اور اُمید کی جگہ اُن معصوم پتلیوں میں
موت کے خوف کا ننگا ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر پھر اُس کے لاشعور
سے زندہ رہنے کی تمنّا ابھر کر اُس کے شعور کو جوش اور ہمت کا پیغام دیتی
ہے۔ اور وہ بھاگتی ہے اس چنگاری کی طرف..... مہیب قہقہے اور
ڈراونی چیخیں اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ بھاگ رہی ہے۔ تیز بھاگ
رہی ہے۔ اُس نشانِ منزل کی طرف۔ آخر پہنچ ہی جاتی ہے چنگاری کے
قریب........ وہ دیکھتی ہے کہ ایک بکھری ہوئی چِتا سے درجنوں ننگے
انسان باندھ دیئے گئے ہیں۔ کسی کا سر جل چکا ہے۔ کسی کا کلیجہ ایندھن
بن چکا ہے۔ کسی کے منہ میں جلتی ہوئی لکڑیاں پھنسا رہی ہیں

کسی کی ہڈیاں چٹخ رہی ہیں .... لڑکی پھٹی پھٹی نگاہوں
سے یہ منظر دیکھتی ہے - اور بے ہوش ہو جاتی ہے ....
میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " اُف ! کیا سنا رہے
ہو دلیپ "۔

دلیپ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے اندازِ تحکم سے بولا " سنو جو
کچھ سنا رہا ہوں "۔ میں خاموش ہو گیا .... اور دلیپ کہنے لگا....
" پھر جب اس لڑکی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ غار کے دم گھونٹ
دینے والے اندھیرے میں نہیں بلکہ اُجالے میں ہے۔ کسی نوجوان
کے بازو اُسے فرحت بخش ہوا - میں اس بھیانک ماحول سے دور...
اُن مہیب قہقہوں کی دنیا سے باہر نکال کر لے آئے ہیں - رشی ! وہ
نوجوان شیطان ہو سکتا ہے ؟

میں نے تعجب سے کہا " نہیں "۔

دلیپ کی آواز میں بے بسی کی جھلک تھی جب وہ بولا " وہ
نوجوان آوارہ تو نہیں ہو سکتا " ؟

میں نے دلیپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " نہیں "

دلیپ کی آواز میں کوئی تبدیلی نہ تھی جب وہ بولا " وہ ننگِ
خاندان بھی نہیں ہو سکتا " ؟

میں نے جواب دیا " نہیں "

دلیپ نے پوچھا " وہ دغا باز تو نہ ہو گا " ؟

میں نے کہا " نہیں "

دلیپ بولا " کوئی یہ تو نہ کہے گا کہ اس مظلوم لڑکی نے اس

نوجوان کو خرید لیا ہے"

میں نے کہا" ہرگز نہیں"

دلیپ کے چہرے کی بلائیں معصومیت لے رہی تھی جب وہ بولا" مگر وہ مہیب قہقہے کہتے ہیں"

میں نے کہا" اُن مہیب قہقہوں کی دنیا تو پیچھے رہ گئی"

دلیپ بولا" مگر اُن قہقہوں کی گونج تو کانوں میں آرہی ہے"

میں نے کہا" تو کیوں سنتے ہو وہ قہقہے"۔

دلیپ گڑگڑا سا اُٹھا اور بولا" بہت اچھے ہو تم رشی.... تم واقعی فن کار ہو۔ تمہیں فن کار کے جذبات کا احساس ہے........ سماج کی اندھیری غار میں سے خود غرضوں کے قہقہوں سے بچا کر... رسومات اور توہمات کی زندہ لاشوں کے قریب سے میں کافی ناتواں سی خوفزدہ لڑکی کو اُجالے میں اُٹھا لایا ہوں"

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا" بہت خوب! تم افسانہ نگار ہی نہیں افسانہ گو بھی ہو دلیپ........ مگر یہ تو بتاؤ یہ سب ہوا کیسے۔

دلیپ بولا" کہتا ہوں........... ہاں پہلے پانی پلواؤ"

میں نے نوکر کو آواز دے کر پانی کا گلاس لانے کے لئے کہا اور دلیپ پانی پینے کے بعد قدرے رُک کر بولا۔" بڑی حسین ہے وہ لڑکی......... اس کی آنکھیں کتنی نیلی ہیں۔ خیر نیلی آنکھیں ہونا تو کوئی بڑی بات نہیں........ اُن آنکھوں میں گہرائی کتنی ہے۔ اتھاہ گہرائی.......... اُن آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر پہروں بیٹھے رہو اُن کی اتھاہ نہ ملے گی ۔ کیف......
مستی .... مدہوشی کے ساغر تو معلوم ہوتا ہے آنکھوں میں
نہیں بلکہ اُن پلکوں ہی پر جھوم رہے ہیں ۔ اور اُن نیلی جھیلوں میں
بہار کی بدمستیاں ہی نہیں .... خزاں کی افسردگی بھی
بہ یک وقت کروٹیں لیتی ہے ۔ یوں تو اس کا سُرخ و سفید چہرہ ..
...... بلوریں گردن .... ہوش رُبا شباب سب ہی قیامت
ڈھاتے رہتے ہیں ۔ مگر آنکھیں .... رشی ! آنکھیں لاکھ
حسین ہوں .... اگر آنکھوں میں گہرائی نہیں ہے اور اس
گہرائی میں کشش نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں .... فن کار کے دل
کو اگر کوئی چیز خرید سکتی ہے تو وہ ایک دوشیزہ کی آنکھیں ہیں ......
رُوح کا حسن جسم کے جلال سے اگر کہیں ہم آغوش ہوتا ہے تو نگاہوں
کے ان دو نقطوں پر .... یہ دو نقطے حیا ۔ شرم ۔ احساس ....
.... نیکی ...... اور محبت کے پیمانے ہیں .... جنہیں ذرا
سی لڑکھڑاہٹ ڈانواڈول کر دیتی ہے ۔

میں نے اُکتاتے ہوئے کہا " اب آنکھوں سے آگے بھی کہو
گے یا نہیں "

دلیپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور بولا " خاک فن کار ہو تم ....
اچھا سُنو آگے " میں خاموش بیٹھ گیا ....

دلیپ بولا ۔ عظیم کو دیکھا ہو گا ..... وہ دُبلا پتلا ......
لمبے لمبے بالوں والا عظیم وہ ترقی پسند شاعر .... بڑا بنا ہُوا
کائیاں ہے نالائق ...... مزدوروں اور کسانوں کو سُرخ سویرے

کا پیغام دیتا دیتا مرا جارہا ہے ...... مگر تم اگر اس کی کھوپڑی کو چیر دو تو اور سے قدامت پسندی کے فریب کا وہ زہریلا لاوا نکلے گا کہ دیکھ کر بے ہوش ہو جاؤ۔" مجھے حضرت سرور یاد آ گئے اور میں مسکرا دیا ....

دلیپ بولا "واقعی رشی .... تمہیں یاد ہو گا ایک جگہ شیکسپیئر نے کہا ہے کہ خوشامد پسند کی خوشامد پسندی انتہا پر اس وقت پہنچتی ہے جب وہ اپنے خوشامدیوں سے کہتا ہے کہ اُسے خوشامد قطعی پسند نہیں ہے .... اسی طرح اِن رجعت پسندوں کا ..... اِنکی رجعت پسندی کا ننگا ناچ اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ عوام میں ترقی پسند ہونے کا دعوے کر کے اُن کی ہمدردی اپنے بودے اشعار اور پھسپھے مضامین سے خریدتے ہیں .... زردار یہ سودا اپنے روپیہ سے کرتا ہے اور یہ لوگ اپنے کلام سے ..... اِنکے کلام میں نہ آرٹ ہوتا ہے ...... نہ جان ..... اِنکی ٹیکنیک ہوتی ہے ۔ کسی بھی طرح عوام کے جذبات کو بھڑکایا جا سکے ..... ابن الوقت کہیں کے ... اُس دن وہ بھنڈی بازار والے مشاعرہ میں عظیم نے اپنے ایک قطعہ سے مشاعرہ کو لوٹ لیا .... اُسی کا یہ ایک شعر تھا ؎

ذہن زردار میں اِک جادوگری رہتی ہے
.... گردن پہ غریبوں کے چھری رہتی ہے ۔

تو یہ پہلا مصرع میلوں لمبا ..... اور دوسرا شروع بھی نہیں ہوا کہ ختم ہو گیا ...... مگر وہ واہ واہ ہوئی ..... وہ داد ملی مشاعرہ میں کہ پوچھو نہ ..... کیوں نہ ملتی .... دوسرے مصرع میں شاعر نے غریبوں

کی گردن پر چھری چلوائی تھی ...... اور وہ بھی ترنم سے گا گا کر۔ بہروپیا کہیں کا ....

ہاں تو وہ عظیم مجھے اُس دن اِسی کافی ہاؤس والی لڑکی ..... نلنی کے ہاں لے گیا ..... نلنی کے والد بشمبرداس جی بمبئی کے بڑے بھاری سٹہ باز ہیں اور مصیبت یہ کہ اُن کو ادب سے بڑا شوق ہے .....

نلنی نے مجھے دیکھتے ہی کہا "مجھے جس کی تلاش تھی عظیم تم اُسے لے آئے" عظیم سُن کر ہکا بکا رہ گیا اور بشمبرداس جی میری طرف دیکھتے ہوئے بول اُٹھے "نلنی یہی تو نہیں وہ افسانہ نگار جو تمہیں کافی ہاؤس میں ملے تھے ؟"

میں خاموش تھا۔ اور رشمی! میں نے اچانک نلنی کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور اُن آنکھوں کی وسعت کا اندازہ لگانا چاہا .... میں اُن آنکھوں میں اُترا۔ اُترتا اُترتا نہ جانے کس دُنیا میں پہنچ گیا مگر مجھے اُن نیلی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہ ہوسکا" ہاں! جانتے ہو وہ عظیم وہاں کیوں آیا جایا کرتا ہے؟ ایک زردار سٹہ باز سے روپیہ اینٹھ کر ترقی پسندوں کا ایک رسالہ چلانے کے لئے .... وہ نلنی کو سادہ لوح .... ادب نواز ..... فراخدل ..... مگر رومان پسند دوشیزہ سمجھتا تھا ...... وہ مزہ آیا ہے پچھلے اتوار کو کہ جب نلنی نے عظیم سے کہا "عظیم صاحب آپ ہمارے یہاں نہ آیا کیجئے ..... مجھے ایک شاعر کو بھیک مانگتے دیکھ کر دِلی کوفت ہوتی ہے۔

ہاں تو اُس ملاقات ہی میں میں نے محسوس کیا کہ میری رُوح کو ایک ایسی جگہ مل گئی ہے جہاں وہ اپنی بلند پروازیوں سے تھکی ہوئی آرام کے

دو سانس لے سکے گی ...... اس کے بعد کچھ نہ پوچھو رشی بھائی ... چاندنی راتوں نے جوہو کے ساحل پر ہمارے رومان کو زندگی کی لطیف صلاحیتیں دیں ..... وہ فرشتہ ہے رشی فرشتہ ..... اُس نے میری رُوح کو ہر آلائش سے پاک کر دیا ہے - اور یہ اُسی کی دی ہوئی ہمت ہے کہ میں اُسے اپنے بازوؤں پر اُٹھا کر قدامت پسندی کے غار سے اور اُن مہیب قہقہوں کی خلاؤں سے نکال لایا ہوں" ..... اور پھر دلیپ اپنے تازہ شیو کئے ہوئے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "اب سو جاؤ رشی دو چار روز ہی میں تمہیں بہت اچھی خبر سناؤں گا" یہ کہہ کر دلیپ مجھے حیران اور ہکا بکا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اِس واقعہ کے پورے پانچ دن بعد وہ مجھے جوہو کے ساحل پر مِلا ...... وہ مجھے ایک طرف لے جا کر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

میں حیران تھا ....

وہ بولا "بڑی شریر ہے نلنی جانتے ہو اُس نے آج مجھے چاند کی قسم کھا کر کیا کہا ہے ؟

میں دلیپ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولا "نلنی کہہ رہی تھی کہ میں اس کی کشتی کا ناخدا ہوں۔

میں نے پوچھا "تو اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے"

اُس نے جواب دیا "ہنسنے کی بات ہی نہیں۔ وہ تو میری ناخدا ہے"

میں نے کہا "محبتوں میں یہی کھیل ہوا کرتے ہیں دلیپ"

دلیپ سنجیدہ ہو گیا اور بولا "مگر رشی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے

محبت کرتے کرتے میں اپنے آپ سے محبت کرنے لگا ہوں......
میں جب آئینہ سامنے رکھ کر اپنے ہونٹوں پر نلنی کی مسکراہٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے نلنی سے نہیں اپنے آپ سے پیار ہونے لگتا ہے۔

میں نے کہا "بڑے جذباتی ہو دلیپ......

دلیپ بولا "میں تمہیں نلنی کے گھر پہلی بار اپنی شادی کے دن لے چلوں گا۔ غالباً ایک مہینہ تک......اور پھر وہ اپنی نئی خریدی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا......"اب میں جا رہا ہوں......میں نے نلنی کے ساتھ پانچ بجے سینما جانا ہے" اور یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

دس مہینے سے وہ مجھے نہ ملا تھا......اُس دن جب میں سونے کی تیاری کر رہا تھا.........وہ اچانک میرے کمرے میں آیا......پھٹا ہوا کرتہ......بوسیدہ سا پائجامہ......خشک اُلجھے ہوئے بال.......وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا "رشی! نلنی میرے بازوؤں سے گر گئی........وہ پھر اُسی اندھیری غار میں چلی گئی ہے.........اُنہی عجیب قہقہوں کی دُنیا میں....

مجھے دلیپ پر ترس آ رہا تھا میں نے کہا "بیٹھو تو........

دلیپ بولا "بیٹھنے کا وقت نہیں ہے........مجھے دینا نگر جانا ہے.........ہاں تو جانتے ہو بشمبر داس نے کیا کہا ہے....
اُس نے نلنی سے کہا ہے "نلنی میں سمجھتا تھا دلیپ سے تمہارا رشتہ ایک گورو اور شِشیہ کا سا ہے.......میں تمہیں ایک آوارہ افسانہ

نگار سے شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا ہوں" اس کے بعد جانتے ہو رشی ! اس حسین اور کمزور سی لڑکی پر مہیب قہقہے اور ہولناک چیخیں ٹوٹ پڑیں .... وہ بے بس ہو کر گر چلی تھی۔ اُدھر چلی لاشوں کے قریب .... اور بہت جلد کوئی چنگاری اس کے دل میں پیوست ہو کر بھڑک اُٹھے گی۔ میں جا رہا ہوں گھر سے تار آئی ہے ...... بہن کا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے ... کہیں وہ بھی کسی ایسی ہی چتا میں نہ جا گری ہو ...... رشی !

اور قبل اس کے کہ میں دلیپ کو جانے سے روکتا وہ چلا گیا .... شائد اپنی بہن کو اپنے بازوؤں پر اُٹھا کر مہیب قہقہوں کی دُنیا سے بچا کر نکالنے کے لئے ...... میرا نوکر بھی دلیپ کی باتوں پر حیران سا کھڑا تھا ...... اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کون تھا یہ بابو جی"؟

میں صرف اتنا ہی کہہ پایا "افسانہ نگار"

رشی پٹیالوی

۴ر دسمبر ۱۹۵۰ء